Monthly
Arxang
Lahore

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 21 واں سال

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

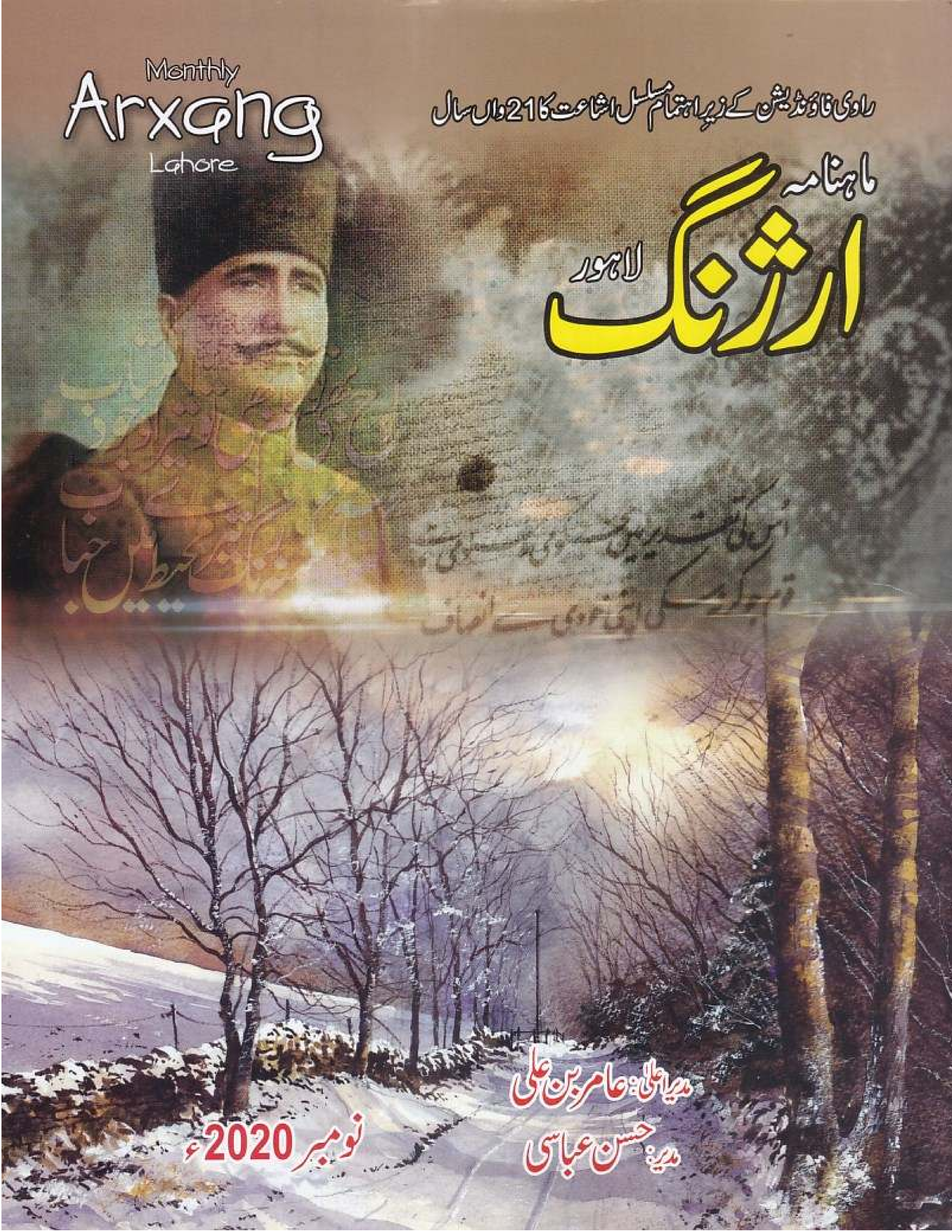

مدیرِ اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

نومبر 2020ء

سرمایۂ ادب احمد ندیم قاسمی کی 105 ویں سالگرہ پر خصوصی گوشہ

ماہنامہ ارژنگ کے لیے احمد ندیم قاسمی کا اپنی سالگرہ کے موقع پر دیا گیا انٹرویو

میں ترقی پسند تھا اور ہوں مگر سیدھا سادہ مسلمان بھی ہوں

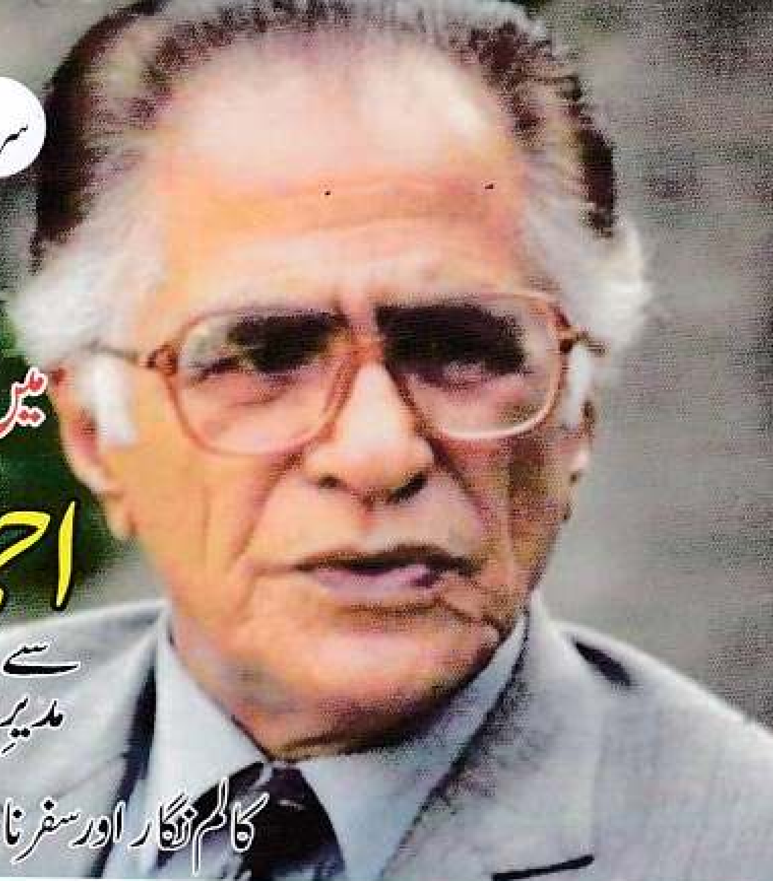

احمد ندیم قاسمی

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر، کالم نگار اور سفرنامہ نگار عامر بن علی کا مکالمہ

میری مخالفت کا آغاز اس وقت ہوا جب رسالہ ''فنون'' جاری ہوا۔

احمد ندیم قاسمی اردو شعروادب اور صحافت کا ایسا روشن حوالہ ہیں جو حقیقی معنوں میں کسی رسمی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کے بارے میں تعارفی جملے لکھنا تکلف زائد یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک فرد ہی نہیں عہد کا نام ہیں۔ اہلِ قلم کا ایک کارواں انہوں نے اپنی زندگی میں تیار کیا جس کے نا صرف وہ میرِ کارواں تھے بلکہ استاد بھی تھے۔ ان کی شاگردی ہمارے لیے ہمیشہ باعثِ اعزاز اور ''قاسمی سکول آف تھاٹ'' سے تعلق افتخار کی بات رہی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی سالگرہ ان کے عقیدت مند ہمیشہ بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے۔ ارژنگ ٹیم کا شمار ان کے نیاز مندوں اور دائرۂ شفقت میں ہوتا تھا۔ ان کی 84 ویں سالگرہ کا اہتمام ماہنامہ ارژنگ نے لاہور کے شیزان ہوٹل میں کیا تھا۔ اسی سالگرہ کی نسبت سے ان سے ہم نے انٹرویو کی فرمائش کردی جو انہوں نے ہمارا دل رکھنے کے لیے پوری بھی کر دی۔ اس موقع پر جو خصوصی ارژنگ شمارہ شائع کیا گیا اس میں یہ تاریخی انٹرویو شامل تھا۔ اگر احمد ندیم قاسمی زندہ ہوتے تو ان دنوں ہم ان کی 105 ویں سالگرہ کا جشن منا رہے ہوتے۔ برسی کی بجائے رفتگان کو یاد کرنے کا بہتر موقع سالگرہ محسوس ہوتا ہے۔ آج دو دہائیوں پہلے ان کی سالگرہ پر شائع کیا گیا انٹرویو ان کے جنم دن کی نسبت سے پیشِ خدمت ہے۔

ادارہ ارژنگ

(باقی اندرونی صفحات پر)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 21 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد نمبر 21 نومبر 2020 شمارہ نمبر 11

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ لبنیٰ صفدر ◉ ابرار ندیم

{مجلس مشاورت}

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ ● زرتاب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹو گرافر ● نعمان حسن : 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس ● محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت ' 2
گوشۂ نعت: صبیح الدین رحمانی ' 3
مضامین:
○ نورِ عفت سے روشن ہیں قلب و نظر / پروفیسر محمد اقبال ' 4
○ عاشقِ رسول نعت گو شاعر-خورشید بیگ میلسوی / عدنان خالد ' 7
○ آہ عمران نقوی / آغا تنویر ' 8
○ حسانی صفات سے متصف نعت / اسد عباس خان ' 9
○ قانون دان اقبال / انور سدید ' 11
○ احمد ندیم قاسمی شعر و ادب کا منفرد قلم کار / ثاقب تبسم ثاقب ' 14
شگفتہ مضامین: ○ نام اور شکلیں / عطاء الحق قاسمی ' 16
○ عشق کا لام / گل نوخیز اختر ' 17
مضامین:
○ شاذیہ اکبر اور اُس کی شاعری / جمیل یوسف ' 18
○ اُردو ادب کا سرمایہ بابائے اُردو مولوی عبدالحق / سجاد بخاری ' 24
○ جواز جعفری کی نظم کا تجزیہ / سلیم نگار ' 27
○ میرے چند ہم عصر / ڈاکٹر محمد طاہر بوستان خان ' 28
○ حسن عباسی کی جدید طویل نظم "محبت سے کون ڈرتا ہے" / ساحل سلہری ' 30
○ سچائی کی زبان-ڈاکٹر اخلاق گیلانی / محمد امین ساجد سعیدی ' 34
○ چھوٹی عمر کا بڑا شاعر-قاسم خیال / پروفیسر شجاع علی ' 35
شعری گوشے:
○ مختار علی، انجینئر ظفر محی الدین، ارشد محمود ارشد ' 36 تا 38
افسانے
○ راکھ / عبدالوحید بسمل / ترجمہ: ڈاکٹر تحسین بی بی ' 39
○ ریزگاری / نوین روما ' 42
سفرنامہ
○ پابلو نرودا کے آنگن میں ایک دوپہر / عامر بن علی ' 45
کالم ○ فرصت سے فری لانسنگ تک / لبنیٰ صفدر ' 47
شاعری: 48 تا 50
○ بقیہ انٹرویو: احمد ندیم قاسمی ' 51
○ بقیہ انٹرویو: صبیح الدین رحمانی ' 53
مختصر ادبی خبریں ' 55
تبصرۂ کتاب ' 56

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

حمد کس طور سرافراز ہے، ماشاء اللہ
لفظ ہر شعر حب انداز ہے، ماشاء اللہ
ورد کس اسمِ معظم کا ہے انفاس اندر
لبِ جبریل ہم آواز ہے، ماشاء اللہ
ذکر و تسبیح سے ہے بندگی، معراج مقام
روح کی عرش پہ پرواز ہے، ماشاء اللہ
حرمِ حمد میں دن رات مراقب ہیں خیال
روح سدرہ کی ہم اعزاز ہے، ماشاء اللہ
لفظ آئینہ ہوئے چہرۂ تنہائی کے
قلم احساس کا غماز ہے، ماشاء اللہ
لفظ سبحان کی گردان ہے دھڑکن دھڑکن
دلِ ہر ذرّہ ہم آواز ہے، ماشاء اللہ
کلک و قرطاس ہمہ نور ہوئے جاتے ہیں
کس حسیں حمد کا آغاز ہے، ماشاء اللہ
آخرِ شب کا ہے ماحول سکینت آثار
ذکر اذکار کا در باز ہے، ماشاء اللہ
حمد کی سمت ریاضؔ غزل آرا کا رجوع
ہنرِ نعت کا اعجاز ہے، ماشاء اللہ

ریاض مجید/فیصل آباد

آنکھیں جھکیں جو بابِ رسالتؐ پناہ پر
عقدے کھلے جمال کے میری نگاہ پر
مدحِ نبیؐ کا مجھ کو سلیقہ، نہیں نہیں
اسلوب کوہ بھی کبھی کھلتا ہے کاہ پر
ذرّے کی کیا بساط کہ وہ تذکرہ لکھے
آفاقِ بے کنار کے خورشید و ماہ پر
یہ تو بس اک ذریعۂ اظہارِ شوق ہے
اس کا بھی انحصار ہے عجز نگاہ پر
قدموں میں رہ گزارِ پیمبرؐ ہو اور بس
ہو لطفِ خاص مجھ سے اسیرِ گناہ پر
ہو خیر کا ضمیمہ مری سرنوشت میں
سرنامۂ کرم مرے حالِ تباہ پر
کھل جائے اے خدا! سفرِ نعت کے لیے
منزل کی راہ، خالدؔ گم کردہ راہ پر

خالد علیم/لاہور

قسمت میں ہو یارب مری طیبہ کا سفر بھی
کھل اُٹھے گلابوں کی طرح دل بھی نظر بھی
میں شب کا مسافر ہوں مگر پھر بھی کسی دن
مجھ پر چمک اُٹھے ترے کوچے کی سحر بھی
تو اتنی بلندی پہ گیا ایک ہی پل میں
انجم بھی ترے نقشِ کفِ پا تھے قمر بھی
اس بزم میں جز آپ کے پہنچا نہ کوئی اور
وہ بزم جہاں جل اُٹھیں جبریلؑ کے پر بھی
لہراتے ہیں جس شاخ پہ چاہت کے شگوفے
اے رحمتِ کل اُس پہ لگے کوئی ثمر بھی
میں اُس میں جو دیکھوں تری صورت نظر آئے
اک آئینہ ایسا کہ تُو ہے آئینہ گر بھی
تو وہ ہے کہ نظروں سے مقدر کو بدل دے
ہے منتظرِ لطف مرے دل کا کھنڈر بھی

سہیل اختر

خدا کا نام نہ لے وہ کبھی خدا کے لیے
کہ جس کا دل نہ دھڑکتا ہو مصطفیٰؐ کے لیے
اگر ہو اذنِ حضوری کی آرزو پوری
تو پھر نہ ہاتھ اُٹھاؤں کسی دُعا کے لیے
وہ ہنس کے بولیں تو کلیاں بھی کھل کے پھول بنیں
کہ ان کی سانس بھی اکسیر ہے ہوا کے لیے
وہ ایک سجدہ ابھی تک مری جبیں پہ ہے قرض
بچا کے رکھا ہے جو اُن کے نقشِ پا کے لیے
مہ و نجوم بھی پاتے ہیں روشنی اُن سے
یہ سب حضورؐ کے محتاج ہیں ضیا کے لیے
میں اُن سے عرضِ تمنا کروں تو کیسے کروں
سلیقہ چاہیے، اظہارِ مدعا کے لیے
لغت تمام ہوئی وصفِ مصطفیٰؐ میں ریاضؔ
کہاں سے لاؤں نئے لفظ التجا کے لیے

صاحبزادہ ریاض احمد رحمانی/خیر پور ٹامے والی

میرے آقاؐ کی جو مجھ پر بھی عنایت ہو جائے
مجھے بھی شہرِ مدینہ کی زیارت ہو جائے
مل گئی دولتِ کونین یہی سمجھوں گا
حاضری کی تیرے کوچے کو اجازت ہو جائے
جن پہ ہو لطف و کرم ان کے بلاوے آئیں
کیا خبر ہم پہ اگر نظرِ محبت ہو جائے
ہوں گناہ گار مگر آس ہے روزِ محشر
میرے مولا تیری نسبت سے شفاعت ہو جائے
شاہ بطحاؐ کی نگر میرے کٹیں شام و سحر
درِ سرکارؐ کی چوکھٹ میری قسمت ہو جائے

عامر بن علی/جاپان

صبیح الدین رحمانی

نعتِ مصطفیٰؐ لکھنا آبرو قلم کی ہے

مثلِ مصطفیٰؐ کا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا
کسی اور کا یہ رُتبہ کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

انہیں خلق کر کے نازاں ہوا خود ہی دستِ قدرت
کوئی شاہکار ایسا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

کسی وہم نے صدا دی کوئی آپؐ کا مماثل
تو یقیں پکار اُٹھا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

مرے طاقِ جاں میں نسبت کے چراغ جل رہے ہیں
مجھے خوف تیرگی کا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

مرے دامنِ طلب کو ہے انھی کے در سے نسبت
کہیں اور سے یہ رشتہ کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

میں ہوں وقفِ نعت گوئی کسی اور کا قصیدہ
مری شاعری کا حصّہ کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

سر حشر ان کی رحمت کا صبیحؔ میں ہوں طالب
مجھے کچھ عمل کا دعویٰ کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

تھے عالی مرتبہ سب انبیاء اوّل سے آخر تک
مگر سرکارؐ سا کوئی نہ تھا اوّل سے آخر تک

نکل آئیں گے حل سب مسئلوں کے چند لمحوں میں
حیاتِ مصطفیٰؐ کو سوچنا اوّل سے آخر تک

اُتارے جسم و جاں پر سارے موسم شادمانی کے
بدل دی شہرِ ہستی کی فضا اوّل سے آخر تک

جنہیں اُمی لقب کہہ کر زمانہ یاد کرتا ہے!
وہی ہیں حامل علم خدا اوّل سے آخر تک

فرشتوں نے مری لوحِ عمل پر روشنی رکھ دی
ثناء خوانِ محمدؐ لکھ دیا اوّل سے آخر تک

ملی ہے کاسۂ فن کو مرے خیرات طیبہ سے
مرا دیوان ہے اُن کی عطا اوّل سے آخر تک

بہارِ نعت سے باغِ سخن لہکا صبیحؔ ایسا
تر و تازہ رہی فصلِ نوا اوّل سے آخر تک

مٹا دل سے غمِ زادِ سفر آہستہ آہستہ
تصوّر میں چلا طیبہ نگر آہستہ آہستہ

زباں کو تابِ گویائی نہیں رہتی مدینے میں
صدا دیتی ہے لیکن چشمِ تر آہستہ آہستہ

اُتاری روح کی بستی میں جلووں کی دھنک اس نے
شکستِ شب پہ ہو جیسے سحر آہستہ آہستہ

جگائے علم کے سورج سکھائی لفظ کی حرمت
کیے وا آگہی کے سارے در آہستہ آہستہ

محبت کا سلیقہ دے دیا وحشی قبائل کو
مٹا صدیوں کی رنجش کا اثر، آہستہ آہستہ

صبیحؔ اُن کی ثناء اور تو کہ جیسے برف کی کشتی
کرے سورج کی جانب طے سفر، آہستہ آہستہ

خواب روشن ہو گئے مہکا بصیرت کا گلاب
جب کھلا شاخِ نظر پر اُن کی رویت کا گلاب

گفتگو خوشبو کے لہجے میں سکھائی آپؐ نے
خارِ نفرت چن لیے دے کر محبت کا گلاب

خُلق کی خوشبو تمام اَدوار میں رچ بس گئی!
باغِ ہستی میں کھلا یوں ان کی شفقت کا گلاب

زیست کے تپتے ہوئے صحرا میں ہے وجہِ سکوں
اُن کی یاد، اُن کی تمنا اُن کی سیرت کا گلاب

ہر صدی ہر عہد کے گلشن کو اُن کی آرزو!
ہر زمانے میں کھلا ہے اُن کی چاہت کا گلاب

عطر آسودہ فضائیں کیوں نہ ہوں اس شہر کی
خاکِ طیبہ کا ہر اِک ذرّہ ہے جنت کا گلاب

نعت لکھتا ہوں صبیحؔ اُن کی عطا کے سائے میں
ہے بیاضِ نعت کا ہر شعر رحمت کا گلاب

کھویا کھویا ہے دل، ہونٹ چپ، آنکھ نم، ہیں مواجہ پہ ہم
روبرو اُنؐ کے لایا ہے اُنؐ کا کرم، ہیں مواجہ پہ ہم

لمحے لمحے پہ آیات کا نور ہے، نعت کا نور ہے
نور افشاں، دُرودی فضا دم بہ دم، ہیں مواجہ پہ ہم

ایک کونے میں ہیں، سر جھکائے ہوئے، منھ چھپائے ہوئے
گردنیں ہیں کہ بارِ ندامت سے خم، ہیں مواجہ پہ ہم

آنسوؤں کی زباں، کر رہی ہے بیاں، اُنؐ سے احوالِ جاں
صرف اپنا نہیں پوری اُمت کا غم، ہیں مواجہ پہ ہم

مسکراتی ہوئی ہر تجلّی ملی، کیا تسلّی ملی
دُور ہوتے گئے سارے رنج و الم، ہیں مواجہ پہ ہم

سب طلب گارِ حرفِ شفاعت کے ہیں، اُن کی رحمت کے ہیں
چہرے چہرے پہ ہے اک سوالِ کرم، ہیں مواجہ پہ ہم

میں نے اس قرینے سے نعت شہ رقم کی ہے
شعر بعد میں لکھا پہلے آنکھ نم کی ہے

یہ خیال رہتا ہے یہ ملال رہتا ہے
مدحتِ نبی میں نے جتنی کی ہے کم کی ہے

میرے ساتھ چلتی ہیں برکتیں دُرودوں کی
میری راہ میں آئے، کیا مجال غم کی ہے

اُن کو سوچتے رہنا بھی تو اک عبادت ہے
اور یہ عبادت بھی ہم نے دم بہ دم کی ہے

میں غزل سے دُور آیا جب سے یہ شعور آیا
نعتِ مصطفیٰؐ لکھنا آبرو قلم کی ہے

اُن کو چاہنے سے میں چاہا جا رہا ہوں صبیحؔ
بھیک میرے دامن میں اُن کے ہی کرم کی ہے

نورِ عفت سے روشن ہیں قلب ونظر

پروفیسر محمد اقبال جاوید

ویسے تو زندگی لمحہ لمحہ قیمتی اور قابل قدر ہے مگر عہد شباب حسین بھی ہوتا ہے اور رنگین بھی، گریز پا بھی ہوتا ہے اور یادگار بھی۔ ہیجان خیز بھی ہوتا ہے اور جذبات پرور بھی۔ شباب نام ہے زندگی کی اس بہار کا جو اُمنگوں کے دامن میں آنکھ کھولتی اور تمناؤں کی گود میں پلتی ہیں۔ جوانی جذبات کی سہیلی اور واردات کی ہمجولی ہے۔ نشۂ صہبا اور ہجوم شوق کے امتزاج کا دوسرا نام شباب ہے۔ اس دور حسیں میں ذرّوں سے بھی آفتاب کی کرنیں نچوڑ لینے کو جی چاہتا ہے۔ جوانی ایک بہار ہے کہ چھا جاتی ہے۔ ایک کشش ہے کہ قلب ونظر کھنچ کے رہ جاتے ہیں۔ ایک جوش ہے کہ ہوش پر غالب آ جاتا ہے۔ ایک حسن ہے کہ ناظر کو مبہوت کر دیتا ہے۔ ایک ولولہ ہے کہ ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے اور زندگی کے لیے مشکل ہے کہ وہ شباب کی دہلیز سے صحیح و سالم گزر جائے کہ یہاں تو:

کوئی کھینچے لیے جاتا ہے خود جیب وگریباں کو

یہ حسین دور جب گزر جاتا ہے تو انسان کے پاس اس کی رنگین یادیں رہ جاتی ہیں۔ جنہیں وہ دل سے لگا لیتا ہے کہ وہ زندگی کی متاع عزیز بھی ہوتی ہیں اور بڑھاپے کی تلخیوں کو بہلانے میں اعانت بھی کرتی ہیں۔

جوانی کے ترانے گا رہا ہوں
دبی چنگاریاں سلگا رہا ہوں

رسول پاک ﷺ کے شباب نے عرب کے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ اپنے اندر لغزشوں کا ایک طوفان اور گمراہی کا ایک ہیجان لیے ہوئے تھا۔ جوانی، دیوانی، عشق آوارہ اور حسن رُسوا تھا۔ شاعری نسوانیت کے تقدس کو پامال کر رہی تھی۔ محبوباؤں کے قصیدے شعراء کی زبان پر تھے۔ عشق و عاشقی کے واشگاف تذکروں نے بیشتر نوجوانوں کو بہکا اور بھٹکا رکھا تھا اور اس پر ناؤ نوش کے ہنگاموں نے ایک ایسے راستے کو ہموار کر رکھا تھا جس پر چل نکلنے کے بعد پسپائی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس گمراہ کن اور حیا باختہ ماحول میں ہمارے نبی ﷺ بھی وہیں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں مگر اس انداز سے کہ زمانہ ان کی حیا سے پارسائی کا سبق لیتا ہے۔ فرشتے ان کے دامن عفت پر نماز پڑھتے ہیں اور شرافت ان کے حسن اخلاق پر والا و شیدا نظر آتی ہے۔

نورِ عفت سے روشن ہیں قلب و نظر
گرچہ رہنے کو شہرِ ہوس میں رہے

حضور ﷺ میں کس ادا کی کمی تھی۔ آپ ﷺ سے زیادہ حسین کسی آنکھ نے نہ دیکھا تھا۔ آپ ﷺ حسن صورت کے اعتبار سے احسن اور اجمل تھے۔ یوں لگتا تھا کہ آپ اپنی مرضی کے مطابق دنیا میں آئے ہیں۔ اس ظاہری کمال و جمال کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے ہر قدم، ہر فعل اور ہر قول کی نگران وہ آنکھ تھی جسے نہ نیند آتی ہے، نہ اونگھ نتیجہ معلوم کہ جذبات کا بہکنا تو کجا، آپ ﷺ کے حاشیہ خیال کو کوئی ہلکی سی آلودگی بھی مس نہ کر سکی۔ اسی لیے عرب کے اس حسین وجمیل اور جسیم وقوی نوجوان پر بھی جوانی آئی مگر ایک لمحے کے لیے بھی حکایت، شکایت نہیں بنی۔ ان کی جوانی تو بہار کا ایک مشک بار جھونکا تھا کہ مہک بکھیرتا چلا گیا۔ ایک شان بے نیازی کے ساتھ اور عرب کی لغویات وخرافات منہ دیکھتی رہ گئیں۔ یوں اس پاک باز نوجوان کی محتاط جوانی ایک ضرب المثل بن گئی۔

زندگی نے شباب کی دہلیز پر قدم رکھا تو آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ نہ باپ کا سایہ ہے نہ ماں کی شفقت، نہ بھائی کا سہارا ہے نہ بہن کا پیار۔ ایک چچا ہی دم ساز ہیں اور وہ بوڑھے ہو چکے ہیں، اس لیے آپ ﷺ عنفوان شباب میں ہی میں ان کے ساتھ تجارتی قافلوں کے ہمراہ جاتے اور مشاہدات و تجربات سے اپنا دامن بھرتے۔ برائیاں آپ ﷺ کو سوچنے پر مجبور کر دیتیں اور اردگرد بکھرے ہوئے قدرتی نظارے آپ ﷺ کی فکر کو مہمیز کرتے۔ نتیجہ معلوم کہ آغاز جوانی ہی میں تدبر و تفکر، فطرت کا حصہ بن گیا اور تدبر و تفکر کے یہی زاویے نبوت کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ کارلائل اسی غور وفکر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

''سفر و حضر میں ہر جگہ محمد ﷺ کے دل میں ہزار ہا سوال پیدا ہوا کرتے تھے کہ میں کیا ہوں؟ یہ لامحدود دنیا کیا چیز ہے؟ میں کن چیزوں پر اعتقاد کروں؟ میں کیا کروں؟ لیکن کیا کوہ حرا کی چٹانیں، چوٹیاں، کھنڈر اور میدان، کسی نے ان سوالوں کا جواب دیا؟ نہیں، ہرگز نہیں، جبکہ گردونِ گرداں، گردشِ لیل ونہار، روشن ستارے، برستے بادل، کوئی بھی ان سوالات کا جواب نہ دے سکا اور نہ اس عقدہ کو حل کر سکا۔''

یہی غور و تدبر تھا جو آپ ﷺ کو حرا کے غار میں لے گیا اور اس غار کی ظلمتیں آپ ﷺ کے وجود ذی جود سے مستنیر ہوتی رہیں۔ وہیں جبریل علیہ السلام آئے اور ان کے اولین پر تو ہی سے قلب ونظر کے ایوان کھل گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ:

جو نکتہ وروں سے کھل نہ سکا، جو فلسفیوں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

حضور ﷺ، عالم شباب میں ہر اس فعل سے محفوظ رہے، جس پر ہلکی سی گرفت اور انگشت نمائی ہو سکتی تھی۔ آپ ﷺ بت پرستی سے متنفر تھے۔ شراب نوشی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ آپ ﷺ ہی کی پاکیزہ زندگی اور مقدس کردار کا اثر تھا کہ اس دور کی بہت سے

شخصیات نے بت پرستی ترک کر دی تھی۔ نبوت سے پہلے اور جوانی کے زمانے میں آپ ﷺ کا حلقہ احباب بھی شریف، سنجیدہ اور قابل قدر افراد پر مشتمل تھا۔ ابوبکر صدیقؓ، حکیم بن حزام عماد بن علبہ، قیس بن ثابت اور مجاہد بن جبیرؓ آپ ﷺ کے جوانی کے دوست تھے اور یہ سب عرب کی اخلاقی پستیوں میں ایسے روشن ستاروں کی طرح تھے جن کے رُخ کردار سے اس دور میں شباب اپنی صحیح سمت متعین کر سکتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو حضور ﷺ کا احترام کرتے تھے جو شراب و زنا، جوئے بازی، بازاری شاعری، شر و کفر، جنگ و جدل، بغض و عناد اور کینہ و فساد سے طبعاً متنفر تھے۔ حکیم بن حزام آپ ﷺ کے دوست تھے۔ وہ حضرت خدیجہ ؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ وہ ۸ھ تک ایمان نہیں لائے تھے لیکن حضور ﷺ کی محبت بہ دستور دل میں موجزن رہی۔ انہوں نے پچاس اشرفیوں کا ایک قیمتی حلہ خریدا، مدینے آئے اور حضور ﷺ کو تحفتاً پیش کیا۔ حضور ﷺ نے اسے لینے سے انکار فرما دیا اور فرمایا کہ تم میرے دلی دوست ہو مگر میں کسی مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کر سکتا۔ البتہ قیمتاً لے سکتا ہوں۔ حکیم بن حزام نے مجبوراً قیمت قبول کر لی۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب عرب کا معاشرہ برائیوں میں جکڑا ہوا تھا، تب حضور ﷺ کی ذات منارۂ رشد و ہدایت تھی۔ لاینحل عقدے آپ ﷺ کی فکر سے حل ہوتے، لوگ آپ ﷺ کے پاس اپنی امانتیں بے خوف و خطر رکھ جاتے۔ آپ ﷺ کی ہر بات صد ہا صداقتوں کا صدف ہوتی تھی۔ آپ ﷺ غریبوں کے حامی، بیواؤں کے مددگار اور یتیموں کا سہارا تھے۔ آپ ﷺ امین بھی تھے اور صادق بھی۔ حق یہ ہے کہ آپ ﷺ کی عظمتِ گفتار و کردار کی شہادت ہر دور دیتا رہا:

تجلیوں سے تری مستنیر و تابندہ
زمانِ ماضی و عصرِ رواں و آئندہ

حضور ﷺ اُمی تھے مگر فراست آپ ﷺ کے گھر کی لونڈی اور بصیرت آپ ﷺ کی خانہ زاد تھی۔

اس دور میں کعبے کی عمارت نشیب میں تھی۔ بارش کا پانی اس میں جمع ہو جاتا تھا۔ عمارت قد آدم بلند تھی اور غیر مسقف تھی۔ قریش نے اسے دوبارہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ تعمیر کعبہ کی ابتدا ہوئی۔ ہر قبیلے نے مختلف حصوں کو تعمیر کیا تاکہ کوئی اس شرف سے محروم نہ رہ جائے۔ تعمیر پورے ذوق و شوق سے جاری تھی کہ حجر اسود کو نصب کرنے کا وقت آیا۔ ہر قبیلہ یہ شرف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فضا کشیدہ ہوئی۔ یہاں تک کہ تلواریں بے نیام ہوگئیں۔ عرب جوش انتقام میں خون کے پیالوں میں اُنگلیاں ڈبو کر جان دینے کا عزم کیا کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے اس موقع پر یہ رسم بھی ادا کر دی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر ایک بزرگ ابواُمیہ بن مغیرہ آگے بڑھے اور فیصلہ کیا کہ کل صبح جو سب سے پہلے حرم میں آئے، اسی کو ثالث سمجھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا کرشمہ دیکھئے کہ حرم کے نواح میں آفتاب کی کرنوں نے سب سے پہلے حضور ﷺ کے چہرۂ انور کو بوسہ دیا۔ خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ معاملہ ایک صادق اور امین کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ ﷺ نے ایک چادر پر حجر اسود کو رکھا۔ تمام سرداروں سے کہا کہ چادر کونوں سے پکڑ کر اُٹھاؤ۔ خود موقع پر پہنچے اور حجر اسود کو مقررہ جگہ پر رکھ دیا۔ یوں خون کی پیاسی فضا امن و آشتی کی بہاروں سے ہم کنار ہوئی۔

اسی دور میں آپ ﷺ نے عربوں کی خوں ریزی اور بدامنی کو دور کرنے کے لیے تمام عمائدین اور اکابر کو یک جا کیا اور انہیں قوم و ملک کی بگڑتی صورت حال کا احساس دلایا۔ چنانچہ ایک امن کمیٹی بنائی گئی جس میں بنو اسد، بنو مطلب، بنو ہاشم، بنو زہرہ اور بنو تمیم کے نمائندے شامل تھے۔ اس کمیٹی کے اراکین نے عہد کیا کہ وہ بدامنی ختم کریں گے۔ مستحقین کی امداد کریں گے، مسافروں کی مدد کی جائے گی، خوں ریزی ختم کر دی جائے گی اور تمام معاملات حسن تدبر سے سلجھائے جائیں گے۔

مکہ کی ایک امیر خاتون حضرت خدیجہ ؓ نے جب آپ ﷺ کے حسن عمل، علو کردار اور کاروباری بصیرت کے قصے سنے تو انہوں نے آپ ﷺ کو اپنا مال دے کر تجارت کی غرض سے بھیجا۔ آپ ﷺ کی دیانت اور امانت سے خوب نفع ہوا۔ حضرت خدیجہ ؓ اس قدر متاثر ہوئیں کہ بات شادی تک پہنچ گئی۔ شادی کے وقت عرب کے اس پاک باز نوجوان کی عمر ۲۵ سال اور اہلیہ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ آپ ﷺ نے شباب کے پندرہ سال ان کے ساتھ محبت اور وفا سے گزارے کہ تاریخ آج بھی اس نوجوان کی مطہر جوانی کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ حضرت خدیجہ ؓ بیوہ تھیں اور اس سے قبل ان کے دو نکاح ہو چکے تھے۔ ان میں سے اولاد بھی تھی۔ حضور ﷺ ان کا ذکر اس محبت سے فرماتے کہ بسا اوقات حضرت عائشہ ؓ کو بھی رشک آتا تھا۔

حضور ﷺ کا خطبہ نکاح جناب ابوطالب نے پڑھا، وہ خطبہ اپنے اندر حضور ﷺ کے اوصاف کا ایک ایسا پیرایہ لیے ہوئے ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس وقت بھی ہر شخص حضور ﷺ ہی کا نعت خواں تھا۔ حضرت ابوطالب کے یہ الفاظ نثری نعت ہی تو ہیں۔

''شکر و احسان ہے اس مالک الملک کا اور رب قدیر کا جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں پیدا کیا اور ہزار حمد و ثنا کا سزاوار ہے۔ وہ خداوند جس نے ہمیں یہ شرف عطا کیا کہ ہم خود کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے کہہ سکیں اور یہ بھی اسی کا احسان ہے کہ ہمیں حرم شریف کی محافظت اور اقوام عرب کی پیشوائی کی سعادت عطا فرمائی۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر و سپاس بار دگر ادا کرنے کے بعد واضح کرتا ہوں کہ میرا بھتیجا محمدؐ بن عبدالمطلب ایک ایسا شخص ہے کہ جس کی

خوبیوں اور ہر دل عزیزیوں میں کوئی شریک و سہیم نہیں۔ اگر چہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسے دولت دنیوی سے بہت تھوڑا مال نصیب ہوا ہے لیکن کچھ پروا نہیں کہ یہ ایک فانی اور زوال پذیر شے ہے۔ اصل چیز محامد ذاتی اور محاسنِ اخلاق ہیں اور میرا بھتیجا ان نعائم خداوندی سے بہرہ وافر رکھتا ہے۔ پس میں پانچ سو درہم طلائی کے عوض خدیجہ بن خویلد کو اس کے نکاح میں دیتا ہوں۔''

الغرض، حضور ﷺ، شباب میں عفت فکر و نظر، بلندیٔ کردار، قوتِ فیصلہ اور امانت و دیانت کا ایک ایسا مرقع تھے جس کے دامن پر کوئی ادنیٰ سا دھبا بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یہی پاکیزہ جوانی تھی جو آپ ﷺ کی پیغمبرانہ صداقت کی سب سے بڑی شہادت تھی۔ چنانچہ جب آپ ﷺ اعلان نبوت فرماتے ہیں تو کوئی اُنگلی بھی آپ ﷺ کے کردار پر نہیں اُٹھ سکی۔ ہر مخالف یہی کہتا رہا کہ محمد ﷺ سچ بولتے ہیں مگر ہم سرگشتہ خمار رسوم و قیود رہیں گے۔ چالیس سال کی عمر تک ایک معاشرہ میں رہنا اور بھرپور زندگی گزارنا، پھر دعوت حق دینا اور پھر شخصی کردار پر بدترین مخالفوں کا بھی اعتراض نہ کر سکنا۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کا سب سے بڑا اعجاز اور ہمارے خدائے رحیم کا سب سے بڑا احسان ہے۔

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	140/- روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	350/- روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	200/- روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	200/- روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	700/- روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	150/- روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	700/- روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	800/- روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	200/- روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	400/- روپے
تنقیدات تحسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	300/- روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	500/- روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	250/- روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	500/- روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	250/- روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	250/- روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	400/- روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	200/- روپے

ناشر: القمر انٹرپرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ اٹھارہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: 24-j ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

عاشقِ رسولؐ نعت گو شاعر...... خورشید بیگ میلسوی کا سفرِ آخرت

عدنان خالد/لاہور

(خورشید بیگ میلسوی غزل اور نعت کے معتبر شاعر ہیں۔ گزشتہ دنوں میلسی میں وفات پا گئے۔ ان کی وفات سے متعلق یہ تحریر معروف شاعر عدنان خالد کی فیس بک آئی ڈی سے لی گئی ہے)

خورشید بیگ میلسوی صاحب وقت وصال سے کچھ دو گھنٹے پیشتر تک بالکل نارمل تھے۔ عشاء کی نماز پڑھی، کھانا کھایا اور کچھ دیر صحن میں ہی چہل قدمی فرمائی۔ رات گیارہ بجے کے قریب طبیعت کچھ ناساز ہوئی لیکن ایسی بھی نہیں کہ فکرمند ہوتے لیکن رفتہ رفتہ طبیعت بگڑتی گئی تو خود ہی اپنی نبض دیکھی اور افرادِ خانہ کو کہا کہ مجھے کہیں لے جا کر خراب نہ کرنا میرا وقت اخیر آ گیا ہے۔ اسی اثنا میں اپنے بھائی مرزا جبار صاحب کو طلب فرمایا اور مسلسل کلمہ شریف کا ورد جاری رکھا۔ کلمہ پہلے بلند آواز میں پڑھتے رہے۔ بھائی آ گئے تو ان سے کسی بھی کمی کوتاہی کے لیے معافی طلب کی اسی طرح باقی افرادِ خانہ سے معافی کے خواستگار ہوئے۔ بیٹیوں کے لیے دعا فرمائی۔ پھر کلمہ جاری کیا۔ آواز رفتہ رفتہ مدھم ہوتی گئی لیکن کلمہ شریف کا ورد جاری رہا۔ یہاں تک کہ خاموش ہو گئے۔ گیارہ بائیس کو طلب کیا گیا لیکن تب تک وہ اپنے خالقِ حقیقی کے حضور حاضر ہو چکے تھے۔ خورشید بیگ صاحب مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ زندگی میں کئی ایسے مواقع آئے کہ اچھے اچھے دہل جائیں لیکن وہ ثابت قدمی سے ڈٹے رہے لیکن چھوٹے بیٹے مرزا سلیم بیگ کی اچانک ناگہانی وفات نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ بظاہر وہ ہنستے مسکراتے دوسروں کو ہنساتے نظر آتے لیکن اندر ہی اندر گھل رہے تھے۔ یہاں تک کہ بیٹی کی اچانک وفات نے رہی سہی ہمت کو بھی توڑ کر رکھ دیا ہے۔ پے در پے ملنے والے صدموں کے باوجود اللہ کی رضا پر راضی رہے۔ گھر والوں کو حوصلہ دیتے رہتے لیکن انسان بہرحال انسان ہے اور انسان جب باپ ہو تو کیا گزرتی ہے ہم صرف اندازہ ہی لگا سکتے ہیں۔ خورشید صاحب آپ ہماری سوچ سے بھی زیادہ مضبوط انسان ہیں۔ آپ کا سفرِ آخرت قابلِ رشک ہے۔ اللہ پاک آپ کے درجات بلند فرمائیں۔ ان کا نعتیہ کلام:

ذکرِ سرکار مدینہؐ کے علاوہ کیا ہے
کوئی بتلائے مرے غم کا مداوا کیا ہے
انؐ کی نعلینِ مبارک کا ہے صدقہ لوگو
ورنہ یہ عالمِ ہستی کا جریدہ کیا ہے
ثبت ہیں ان پہ ترے نقشِ کفِ پا ورنہ
کیا ہے صحرائے عرب، وادیٔ سینا کیا ہے
جب ترے دل میں نہیں، ہجرِ مدینہ کی خلش
پھر تری آنکھ میں یہ اشک کا دریا کیا ہے
عاشقانِ شہِ لولاکؐ سے پوچھے کوئی
باغِ فردوس ہے کیا، شہرِ مدینہ کیا ہے
آپؐ کی ذات ہے قرآنِ ہدیٰ کی تفسیر
آپؐ سے بڑھ کے بھلا اس کا خلاصہ کیا ہے
دیکھنا یہ ہے کہ اس عہدِ ستم میں ہم نے
چھوڑ کر آپؐ کی سیرت کو گنوایا کیا ہے
نعتِ آقاؐ سے ملی عزت و شہرت خورشید
بجز اس کے مرا دنیا میں حوالہ کیا ہے

....

نعت میں جدتِ اشعار کہاں سے لاؤں
شوکتِ حرفِ گہربار کہاں سے لاؤں
میں تہی دست ہوں، نادار ہوں، بے مایہ ہوں
ہدیۂ ندرتِ افکار کہاں سے لاؤں
چشمِ الطاف و کرم ہو مرے آقاؐ مجھ پہ
آپؐ سے بڑھ کے میں غم خوار کہاں سے لاؤں
ہوں غلامانِ محمدؐ کے غلاموں کا غلام
انؐ کے کردار سا کردار کہاں سے لاؤں
انؐ کے جلووں کو نگاہوں میں سمیٹوں لیکن
شرفِ دیدۂ بیدار کہاں سے لاؤں
ماسوا آپؐ کے الطاف و کرم کے آقاؐ
آنکھ میں خواہشِ دیدار کہاں سے لاؤں
آپؐ کی شان کے شایاں ہو جو مرزا خورشید
میں وہ پیرایۂ اظہار کہاں سے لاؤں

بہ یاد: سید قاسم محمود
Monthly Book Digest
بک ڈائجسٹ لاہور
ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com
مدیر اعلا: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

فروغِ ادب کے لیے وقف
براہِ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری، نثر) کمپوز کروا کے "ان پیج" میں ای میل کروایا کریں
bookdigest@hotmail.com
آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ رسالے کے حصول کے لیے سالانہ زرِ تعاون مبلغ -/1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔
برائے خط کتابت / ترسیل زر / رابطہ
بک ڈائجسٹ
کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
0333-4377794 - 042-37322996

آہ عمران نقوی!

آغا تنویر/کراچی

نامور شاعر، ادیب، صحافی اور خدمت گارِ نعت جناب عمران نقوی کا تعلق لاہور کے علاقہ شاہدرہ سے تھا اور وہ عظیم محقق پروفیسر ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی (شہید) کے برادرِ اصغر تھے۔ آپ کافی عرصہ تک روزنامہ نوائے وقت سے منسلک رہے اور اخبار کے ادبی ایڈیشن کے لیے لاتعداد فیچرز لکھے اور وقت کی اہم اور معتبر ادبی شخصیات کے انٹرویوز کیے۔ جبکہ بعدازاں وہ نظریہ پاکستان ٹرسٹ سے وابستہ رہے۔ شاعری میں بھی عمران نقوی نے خوب مقام بنایا اور متعدد شعری مجموعے تخلیق کیے جن میں ایک خوبصورت مجموعہ نعت ''وجب الشکر علینا'' بھی شامل ہے جو 2011ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

ان کی دیگر شعری ونثری کتب میں ''خیمۂ شام، حرف ملاقات، حرف زار، شرفِ ملاقات اور کل دی گل اے وغیرہ شامل ہیں۔

ان کی تخلیقات پر انہیں متعدد قومی اور صوبائی ایوارڈز اور دیگر اعزازت سے نوازا گیا۔ انہوں نے نعتیہ ادب سے منسلک اہم شخصیات کی زندگی اور فن کے حوالے سے جامع کتب بھی ترتیب دیں جن میں پروفیسر ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی کی حیات وخدمات پر کتاب ''دلیلِ آفتاب'' اور مجددِ نعت جناب حفیظ تائب کی خدمات کو بیان کرتی ''اک شخص مہکتی چھاؤں سا'' شامل ہیں۔

ان کی چند منتخب نعتیں نذرِ قارئین:

مدحتِ شاہِ زمن تک پہنچی
فکر فردوسِ سخن تک پہنچی
سوچ اک کنجِ حرا سے پھوٹی
بات خوشبو کے چلن تک پہنچی
نام اک امی لقب کا آیا
بوئے خوش رنگ دہن تک پہنچی
نعت میں جب سخن آغاز کیا
روشنی دیدۂ فن تک پہنچی
رحمت اس شاہ عرب کی عمران

....

تمیز بندہ و آقا مٹانے والے سلام
جہاں کو خیر کا رستہ دکھانے والے سلام
منات و لات وہبل پاش پاش کر ڈالے
خدا کے گھر سے بتوں کو ہٹانے والے سلام
نکالا دہر کو مکر و فریب ونخوت سے
دلوں پہ نقش صداقت بٹھانے والے سلام
مجھ ایسے بے بصر و بے نوا و بیدل کو
ردائے لطف وکرم میں چھپانے والے سلام
ضیائیں بخشے ابد تک جو نسلِ انساں کو
پیام ایسا جہاں کو سنانے والے سلام
چھڑایا دہر کو پت جھڑ کے تخت موسم سے
رہِ حیات کو گلشن بنانے والے سلام
دہائی دیتے ہیں عمران قلب و جاں میرے
ہم عاصیوں کو گلے سے لگانے والے سلام

....

روشنی روشنی پکارتا ہوں
یا نبیؐ یا نبیؐ پکارتا ہوں
گنبدِ سبز جب سے دیکھا ہے
دیدنی دیدنی پکارتا ہوں
آگہی ان کے در سے ملتی ہے
آگہی آگہی پکارتا ہوں
جب محمدؐ زبان پر آئے
سرمدی سرمدی پکارتا ہوں
اُمتی اُمتی نہ سن پایا
بے بسی بے بسی پکارتا ہوں
میں ازل سے غلام زادہ ہوں
سیدیؐ سیدی پکارتا ہوں
جب بھی نعت رسولؐ کہتا ہوں
ان کہی ان کہی پکارتا ہوں
دھڑکنیں خود درود پڑھتی ہیں
میں تو بس یا نبیؐ پکارتا ہوں
ان کی سیرت پہ جب نظر جائے
روشنی روشنی پکارتا ہوں
جب بھی نعت رسول کہتا ہوں
ان کہی ان کہی پکارتا ہوں
یا خدا یا خدا کے بعد عمران
یا نبیؐ یا نبیؐ پکارتا ہوں

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

....

ماہنامہ ارژنگ کے تمام قارئین کو
جشن عید میلادالنبیؐ مبارک ہو
سرکارؐ کی آمد مرحبا

حسّانی صفات سے متصف نعت

اسد عباس خان

حضور ضیاء الامت، سراج العلماء پیر محمد کرم شاہ الازہری نے ضیاء القرآن میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

''بے شمار اعلیٰ پایہ کے لوگوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے ذکرِ پاک کو بلند کرنے کے لیے جس طرح اپنی زندگیاں، اپنی علمی توتیں، روحانی لطافتیں، اپنا مال اور اپنے وسائل وقف کیے ہیں اور آپ ﷺ کے عشاق نے نظم ونثر میں انسانیت کو جو پاکیزہ ادب عطا کیا ہے اس کی نظیر ہی نہیں ملتی۔ آپ ﷺ کا نام پاک لیکر، آپ ﷺ کا ذکرِ خیر کر کے اور آپ کے محاسن سُن کر کروڑوں دلوں کو جو سرور و فرحت نصیب ہوتی ہے اس کا جواب ہی نہیں۔''

نسیم سحر کی ''نعت نگینے'' عشق مصطفوی کے نور سے معمور ایسی نعتیہ شاعری ہے کہ جو قاری کو عشق محمدی ﷺ اور نعت کے نئے ذائقے سے روشناس کراتی ہے، حرف حرف اسی نورِ عشق سے تاباں اور منور ہے، مسحور کُن شاعری کہ پڑھتے ہوئے وارفتگی اور وجد آجائے، پڑھتے پڑھتے حاضری اور حضوری مل جائے،

بغیر اُن کی اجازت کے کب یہ ممکن تھا
دیا ہے اذن نبیؐ نے تو نعت لکھی ہے
انہی کے فیض سے جاری ہے نعت کا چشمہ
انہی کی جلوہ گری نے تو نعت لکھی ہے

نسیم سحر کو یہ فیض اسی عشق کامل سے نصیب ہوا ہے ورنہ انؐ کے اذن و اجازت کے بغیر نعت لکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اور یہ کتاب ''نعت نگینے'' اول سے آخر تک عشق کا سفر نامہ ہے، روحانی اور باطنی سفر نامہ اور ایک الگ تجربہ، جو حضوری اور کیفیت سے کیا جاسکتا ہے۔ عارف کامل باھُو نے فرمایا:

باجھ حضوری نہیں منظوری

نسیم سحر کو حضوری اور منظوری عطا ہوئی تو یہ جہان نعت میں مرجع الخلائق ہو گئے، عشاق کے لیے الگ سے ریاضِ نعت بنا دیا، کہ عشاق پل پل نعت کے نگینے چنتے رہیں، عبادت ہوتی رہے، ذکر اور فکر جاری رہے، نعت کے پیاسے نسیم سحر کے چشمۂ نعت سے سیراب ہوتے رہیں، حسان بن ثابت، کعب بن زہیر، سعدی اور جامی کے خاندان کے فردِ فرید، نسیم سحر کی نعت ''حسانی صفات'' سے متصف ہے کہ انہوں نے جناب رسالت مآب کی سیرت کو لفظ لفظ اپنے اندر اُتارا ہے تب جا کے کہیں نعت کہی ہے۔ تو مشرف ہو رہے ہیں، نعت نعت ایک الگ اور منفرد طرز سے کلام کر رہے ہیں، جیسے عاشق کا کلام ہوتا ہے۔ تنوع اور انفرادیت کی تو بات ہی کیا ہے؟

جنت بھی اس گھڑی تو نہیں ہے مجھے قبول
طیبہ میں ہوں میں آپؐ کے قدمین میں ہوں میں
یہی یقین ہے اور صدقِ ایمانی بھی یہی ہے،

مولانا جامی اپنا مشہور قصیدہ لکھ کر جب عازمِ مدینہ طیبہ ہوئے تو جام پورے رینگنے لگ گئے، کہنیوں کے بل۔ پھر اس سے آگے کا سفر اللہ پاک اور اس کا رسول جانتے ہیں۔

یقین اور صدق سے جب نعت کہی جاتی ہے تو شاعر انہی گھڑیوں سے گزرتا ہے، جیسا کہ حال نسیم سحر کا ہے۔ جن کو، جی ہاں جن کو ان کے قدمین شریفین میں جگہ مل گئی، بادشاہ ان پر رشک کرتے ہیں، نسیم سحر نعت کے سفیر ہیں، ان کا ادبی سفر گویا نعت کا سفر ہے، کروٹ کروٹ وہ نعت میں جاگتے سوتے ہیں، حضور میں حاضر رہتے ہیں، نعت کہتے ہیں اور کہیں غیب سے مولانا جامیؒ کو سنتے ہیں۔ حسان اور کعب بن زہیر کو سنتے ہیں۔ یہیں سے ان پر معرفت اور حیرتِ دوام کے دروازے کھلتے ہیں۔ تاریخ انسانی گواہ ہے کہ سب سے زیادہ عجائبات عشاق پر کھلتے ہیں۔ پیر مہر علی شاہ نے جس عالم محویت میں ''گستاخ اکھیاں کتھے جا اڑیاں'' لکھی تھی، وہی عالم محویت ہی نعت کا سفر ہے، مگر سب سے پہلے تو یہی تعین ہو گا کہ عشق ہے بھی سہی یا نہیں، اس باب میں نسیم سحر کی نعت اور نبی اکرم ﷺ کا ادب ان کے عشق کی دلیل ہے۔

گداز اور سچائی کی روشنی سے بھری ہوئی ان کی نعت دل سے روح میں اترتی چلی جاتی ہے۔

نسیم اسمِ نبی صلِ علیٰ کا ورد کرتے ہی
اندھیرے دور ہو جاتے ہیں سارا گھر چمکتا ہے
میں جو سجدہ بھی صحنِ مسجدِ نبویؐ میں کر آؤں
ستارہ بن کے برسوں میرے ماتھے پر چمکتا ہے

نسیم سحر کی روح یادِ رسول ﷺ سے منور و معطر ہو گئی ہے، وہ ذکر پاک کرتے ہیں تو اس سے صرف اندھیرے دور ہی نہیں ہو جاتے بلکہ سارا گھر ہی چمکنے لگ جاتا ہے، شوق دا دیوا بال ہنیرے متاں لبھی

یارکھڑاتی ہو۔نسیمِ سحرؔ نے بھی اپنے اندر وہی شوق کے دیے جلائے ہیں توان کو حضورﷺ مل گئے ہیں اور حاضری حضوری نصیب ہوگئی ہے۔

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے

نعت نگینے روایتی نعت نہیں۔ بلکہ اک نورنامہ ہے، جو اہلِ علم و ادب اور اہلِ عشق کے راستوں کو مزین کررہا ہے، تاکہ آئندگان کے لیے ایک توشہ بن جائے، رختِ سفر بن جائے، بذاتِ خود نسیمِ سحر کے لیے بھی توشہ دنیا وآخرت ہے۔مکرم ہوگئے ہیں نسیمِ سحر، عجز اور محبت بھرا اسلوب اس بارگاہِ بیکس پناہ میں منظور مقبول ہوگا۔

مدینے کے انوار گویا نسیم
نگہ در نگہ کہکشاں دیکھیے

جب بھی درود بھیجا ہے اس ذاتِ پاک پر
اتری ہیں جیسے روح کے اندر تجلیاں

نسیمِ سحر کی نعت نگینے کے حرف حرف سے وہی ''تجلیاں'' ظہور کرتی ہوئی ''نگہ در نگہ کہکشاں'' بن جاتی ہیں۔ لفظ جگمگانے لگ جاتے ہیں۔ اطراف میں روشنی ہونے لگ جاتی ہے۔ یہ نسیمِ سحر کا مقام ہے، کیونکہ نسیمِ سحر پر نعت کی طریقت سات رنگ سے کھلی ہوئی ہے، رنگ سات ہیں، باقی ان سے وجود میں آئے۔اور اب سبھی رنگ، جو نعت کی طریقت کے ہیں نسیمِ سحر کی نعت میں سما گئے ہیں۔

جو حرفِ نعت مرا مستجاب ہونے لگا
میں ایک ذرہ تھا اور آفتاب ہونے لگا

نسیمِ سحر کو جب اپنا ذرہ ہونے کے یقین کی تصدیق ہوئی تو ان کی نعت کا حرف مستجاب ہوا۔اور وہ خود باریاب ہوئے۔ وہاں جہاں صرف بیدار بخت باریاب ہوسکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ نسیمِ سحر بھی نعت نگینے لے کر وہیں کھڑے ہوئے ہیں، اور وہ چشمِ کرم ہے کہ مسلسل نسیمِ سحر کے ''حال'' پر پڑی رہی ہے۔ یہ نسیمِ سحر کا ایک دائمی درود ہے، جو نسیمِ سحر پل پل حضور بادشاہ کی طرف تحفتاً بھیج رہے ہیں، اور نسیمِ سحر پر معرفتِ نعت کے اسرار ورموز کھل رہے ہیں، نعت کے وہ اسرار جو حسان بن ثابت پر کھلے، ان کے حرف مستجاب ہوگئے ہیں۔

جو نعت کہوں اس میں مدینے کی ہو خوشبو

ان کی نعت سے مدینے کی خوشبو کیونکر نہ آئے۔

یوں ہوا کہ جس خشوع وخضوع اور محبت وعشق سے یہ نعتیں رقم ہوئیں ہیں، ان کا ہر ہر حرف جہاں باریاب ہوا وہاں مدینہ یاب ہوا۔نسیمِ سحر صحابہ کرام کے سکول آف تھاٹ سے جڑے ہوئے ہیں، انہوں نے مدینے کی دانش سے اکتسابِ فیض ونور کیا ہے۔

جس نے مدینے کی دانش سے پایا فیض نسیم
اس کا رستہ بھی روشن ہے اس کی منزل بھی روشن

عزیز احسن نے نعت نگینے میں اسی طرف دلکش انداز میں اشارہ کیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ نسیمِ سحر نے اپنی نعت کی فضا یکسوئی سے بنائی ہے اور جگہ جگہ لفظ ''مدینے'' کے استعمال سے۔کیونکہ مدینہ نسیمِ سحر کے اندر کی آواز اور موسم ہے، یہ مدینہ کی دانش کا کمال ہے کہ انہوں نے اتنی خوبصورت اور باکمال نعتیں لکھی ہیں ۔عزیز الحسن مجذوب نے بھی اسی طرح اپنی نعت میں ''نعت'' موضوع بنایا۔لیکن انہوں نے چند نعتیں لکھی ہیں جو کشکول مجذوب میں شائع ہوئی ہیں۔نسیمِ سحر نے ایک نوری تسلسل اور جمال کے ساتھ مدینہ کو اپنی شعریات میں مذکور کیا ہے، دل کی مکمل سرشاری اور تابعداری سے نعت رقم کی ہے، ایسی متنوع کہ اردو زبان کو مالا مال کرتی ہوئی۔اور اردو زبان کے دامن کو بھرتی ہوئی۔مگر یہ عشق کی زبان ہے، دنیا کی تمام زبانوں سے افضل وارفع اور منفرد زبان، جو نسیمِ سحر کی زبان ہے۔عشق کی زبان و بیان اور نعت خود حضورؐ پاک سماعت فرماتے ہیں۔نسیمِ سحر کتنے خوش نصیب ہیں جو ''نعت نگینے'' لے کر حضورِ پاکؐ کی بارگاہ میں کھڑے ہوئے ہیں:

مدحتوں کا ہے سیل رواں اور میں اور پھر یہ بیاں
میں مدینے میں ہوں میں مدینے میں ہوں میں مدینے میں ہوں

کرنل سیّد مقبول حسین

یادِ نبیؐ میں گریۂ ہجراں کی بات ہو
کچھ چشمِ نم سے جلوۂ جاناں کی بات ہو

اے سیّدِ لولاک ہے رنجیدہ بہت دل
بس بے قراریٔ شبِ گریاں کی بات ہو

اب ناتواں ہے دل مرا آنکھیں بھی خشک ہیں
دل سے نکلتے قطرۂ نیساں کی بات ہو

آقا تمہارے در پہ میں آیا ہوں دور سے
اب صرف سبز گنبدِ ذیشاں کی بات ہو

کیسی ہے پرسکون فضا تیرے شہر کی؟
کچھ تو علاجِ تنگیٔ داماں کی بات ہو

قانون دان اقبال

انور سدید

علامہ اقبال کی ابتدائی زندگی کی ذوقی تربیت ادب کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ ان کی طالب علمانہ زندگی پر سیّد میر حسن کی شخصیت حاوی تھی اور وہ اپنے شاگردوں میں اُردو، فارسی اور عربی کا صحیح لسانی ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ فارسی کے کسی شعر کی تشریح کرتے تو موضوع کی مناسبت سے اردو اور پنجابی کے مترادف اشعار پڑھ ڈالتے۔ سکول کے بعد اقبال کا زیادہ وقت میر حسن کے ہاں ہی گزرتا تھا۔ اس دور میں ہی اقبال مصرعے موزوں کرنے لگے اور پھر رفتہ رفتہ باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ اقبال ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۸۹۵ میں مزید تعلیم کے حصول کے لیے لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ لاہور آتے ہی ان کی توجہ مشاعروں نے کھینچ لی اور انہوں نے نامور شاعر نواب مرزا داغ دہلوی سے تلمذ بھی قائم کر لیا۔ حکیم شہباز دین کی بیٹھک اور حکیم شجاع الدین کے مشاعروں میں اقبال شرکت کرتے اور ان کی غزلیں رسالہ ''شورِ محشر'' میں شائع ہوتیں۔ ان کے اس شعر کی داد مرزا ارشد گورگانی نے دی جو دلی سکول کے نمائندہ تسلیم کیے جاتے تھے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

شیخ عبدالقادر نے لاہور سے رسالہ ''مخزن'' جاری کیا تو اس میں اقبال کی نظم ''ہمالہ'' شامل کی اور پھر اپریل ۱۹۰۱ء کے بعد اقبال کا کلام پورے برکوچک ہندوستان کے علمی و ادبی حلقوں میں پہنچنے لگا۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں نظمیں پڑھ کر جہانِ اسلام سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔

اس اجمال سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ شاعری کی طرف اقبال کا رجحان طالب علمی کے زمانے میں ہی منعطف ہو گیا تھا اور اس فطری شاعر نے اس رجحان کی پرورش زندگی کے آخری دور تک خونِ جگر سے کی اور شاعری کو ہی اپنے تصورات و نظریات کا نقیب بنایا۔ چنانچہ انہیں نہ صرف ''شاعرِ مشرق'' تسلیم کیا گیا بلکہ بیسویں صدی ہی ان سے منسوب کر دی گئی۔ اقبال کی یہ حیثیت جاوداں ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال کی سماجی شخصیت کا ایک اہم زاویہ جس سے وہ اپنی اور خاندان کی کفالت کرتے رہے تھے پس منظر میں چلا گیا۔ میری مراد ان کے وکالت کے پیشے سے ہے جس کے بارے میں تحقیق و انکشافات کا باب جناب ظفر علی راجا نے کھولا ہے جو نہ صرف لاہور کے معروف قانون دان ہیں بلکہ قلم و قرطاس کے دھنی بھی ہیں اور عاشقانِ اقبال کے قبیلے کے فرد بھی شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے اقبال کی عملی زندگی کے اس گم شدہ گوشے کی تحقیق کا بیڑہ اُٹھایا اور اپنی کتاب ''قانون دان اقبال'' پیش کی۔ جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال نے ''پیش لفظ'' میں لکھا ہے:

''اقبال کی ۲۶ سالہ وکالتی زندگی پر آج تک کوئی کتاب یا کوئی ایسا تحقیقی کام نہیں ہو سکا جو بطور قانون دان اقبال کی مصروفیات، معمولات، اسلوب وکالت، عدالتی کارکردگی، قانون فہمی، اسلامی آئین و قانون کے حوالے سے ان کے فکر و فلسفہ اور ہندوستان میں مسلم معاشرتی اصولوں سے متصادم قوانین پر ان کے فکر کو اجاگر کرتا ہو۔ ظفر علی راجا نے اپنی کتاب ''قانون دان اقبال'' میں اقبال کی وکالتی زندگی کے بہت سے نئے گوشوں کو پہلی بار دریافت اور مرتب کیا ہے۔''

ظفر علی راجا کی تحقیق کے مطابق اقبال نے ''لاہور لاء سکول'' میں قانون کا امتحان دسمبر ۱۸۹۸ء میں دیا تھا لیکن جیورس پروڈنس (Jurce prodence) کے پرچے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ راجا صاحب نے اقبال کی شاعری سے محبت کی تردید نہیں کی لیکن انہوں نے خرم شفیق کے حوالے سے یہ لکھا کہ ''غالباً ۱۸۹۲ ہی سے اقبال نے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کا سوچ لیا تھا'' اور پھر اقبال کی اس پیشے میں دلچسپی کی گراں قدر تحقیق کی ہے۔ چنانچہ اقبال ۱۹۰۵ء میں مزید تعلیم کے لیے انگلستان گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق پروفیسر آرنلڈ کی کاوشات کے سبب اقبال کو ٹرینٹی کالج کیمبرج میں داخلہ مل گیا تو انہوں نے اس کے ساتھ ہی ۶ نومبر ۱۹۰۵ء کو ''لنکز ان'' بیرسٹری کا کورس کرنے کے لیے داخلہ لیا جہاں سے یکم جولائی ۱۹۰۸ء میں بیرسٹرایٹ لاء کی ڈگری حاصل کی اور وطن واپس آئے تو انہیں علی گڑھ کالج کی طرف سے پروفیسری کی پیش کی گئی لیکن اقبال نے وکالت کے پیشے کو فوقیت دی اور ۳۰ راکتوبر ۱۹۰۸ء کو بیرسٹر محمد اقبال کا نام عدالت عالیہ لاہور کی فہرست وکلاء میں باضابطہ طور پر شامل کر لیا گیا۔ جہاں اس وقت سر میاں محمد شفیع، جسٹس شادی لال، جسٹس شاہ دین، لالہ لاجپت رائے اور سر میاں فضل حسین

جیسے اقلیمِ قانون کے ستارے جگمگا رہے تھے۔ ظفر علی راجا نے لکھا ہے:

''اقبال وکالت کے پیشے میں داخل ہوئے تو ان کی توجہ شاعری کی طرف کم کم ہوگئی۔ بار کی رکنیت کے اگلے دو تین سال کے دوران یعنی ۱۹۱۱ تک اقبال نے بہت کم شاعری کی۔''

انہوں نے یہ واقعہ بھی اقتباس کیا ہے کہ سر کشن پرشاد نے ایک مرتبہ پوچھا ''کیا آپ نے شاعری کا شغل ترک ہی کر دیا ہے'' تو اقبال نے طنزیہ انداز میں جواب دیا:

''بھائی! ''گدھا'' یعنی پیٹ...... دم بھر کے لیے مہلت نہیں دیتا...... لاؤ چارہ...... لاؤ چارہ...... خدا غارت کرے...... قانونی مشاغل میں اشعار کے لیے کہاں سے وقت نکلے...... دل و دماغ دونوں کام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر پیٹ کا حکم ہے کہ ہماری رضا کے بغیر ایک خیال یا ایک تاثر اپنے اندر داخل نہ ہونے دو۔ عجب کشمکش کی حالت ہے مگر شکایت نہیں کہ ہمارے مذہب میں شکایت ہی کفر ہے۔''

ظفر علی راجا کا یہ انکشاف بھی اہم ہے کہ قانون اور عدلیہ کی تشریحات سے آگاہی کے لیے بیرسٹر اقبال نے ۱۹۰۹ میں ایک قانونی رسالے ''انڈین کیسز'' (Indian Cases) کے حلقہ ادارت میں شمولیت اختیار کی تو اس میں کچھ مالی منفعت بھی شامل تھی لیکن اہم بات یہ ہے کہ اس قانونی رسالے کی پوری ادارتی ٹیم میں واحد قانون دان ایڈیٹر ہونے کا اعزاز اقبال کو حاصل ہوا۔ (کتاب میں اس رسالے کے سرورق بھی شامل اشاعت کیے گئے ہیں۔ اقبال کا نام یوں درج ہے:

''شیخ محمد اقبال، بی اے (کینٹب)، ایم اے (پنجاب)، پی ایچ ڈی (میونخ)، بیرسٹر ایٹ لا، ایڈووکیٹ، چیف کورٹ، پنجاب لاہور''

اس کتاب میں اقبال کی مالی پریشانیوں کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے کہ وکالت کے ابتدائی دور میں اقبال کو سخت محنت کرنا پڑی تھی۔ اپنی تین بیویوں اور اولادوں کے علاوہ بڑے بھائی کی اولاد کے اخراجات بھی ان کے ذمہ تھے۔ مالی پریشانیوں کے اس دور میں سر کشن پرشاد نے وظیفے کا اہتمام کرنے کی اجازت طلب کی تو اپنی غیرتِ فقر کو قائم رکھا اور بڑے سلیقے سے وظیفہ لینے سے انکار کر دیا۔

اقبال وکالت کو اللہ پر توکل رکھنے والوں کا پیشہ قرار دیتے تھے۔ چنانچہ قانون دان کی حیثیت میں ان کی شہرت بڑھی تو ان کی آمدنی میں اتنا اضافہ ہوگیا کہ وہ ۱۹۱۷ء کے بعد ٹیکس بھی ادا کرنے لگے اور بالعموم اتنے ہی مقدمے لیتے جن سے گزر اوقات آسانی سے ہو جاتی تھی۔ بیرسٹر اقبال اپنے موکلین کے کہنے پر روپے پیسے کے لالچ میں جھوٹے کیس لینے پر ہرگز تیار نہ ہوتے تھے۔ ظفر علی راجا نے لکھا ہے:

''اقبال نے ایک مرتبہ ایک موکل کو بتایا کہ اس کا مقدمہ بے جان ہے اس لیے وہ اس کی پیروی نہیں کر سکتے۔'' موکل بضد رہا کہ آپ منہ مانگی فیس لے لیں۔ اگر فیصلہ میرے خلاف ہوگیا تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ مگر اقبال نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ میں حرام کی کمائی کا قائل نہیں ہوں۔''

وکالت کے پیشے میں علامہ اقبال کے بلند کردار کے اس قسم کے روشن نقوش مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں لیکن ظفر علی راجا کو حیرت اس بات پر ہوئی کہ ہائی کورٹ لاہور بار میں یہ غلط تاثر بھی موجود تھا کہ اقبال کی وکالت برائے نام تھی۔ ان کا زیادہ وقت ثقافتی، سماجی، سیاسی اور تعلیمی و شاعری کی سرگرمیوں میں صرف ہوتا تھا۔ وہ زیادہ تر مقدمات میں بیرسٹر محمد شفیع کی معاونت کرتے اور خود مقدمات کی تیاری نہیں کرتے تھے۔ ان کی دلچسپی گپ شپ اور لطیفہ بازی میں زیادہ تھی اور فوجداری مقدمات کے برعکس محنت طلب سول مقدمات سے گریز کرتے تھے۔ اس قسم کے منفی تاثرات نے راجا صاحب کو تحقیق پر مائل کیا اور انہوں نے ۱۹۰۸ سے ۱۹۳۴ تک کے قدیم قانونی ریکارڈ اور رسائل تلاش کیے اور ان سب مفروضہ باتوں کی تردید کی۔ ان کی تحقیق کے مطابق ۱۱۰۴ ایسے فیصلہ جات دستیاب ہوئے جن میں اقبال خود پیش ہوئے اور اپنے ٹھوس قانونی دلائل سے پچاس فیصد سے زیادہ مقدمات میں کامیابی حاصل کی۔ راجا صاحب کو ۱۱۰۳ ایسے مقدمات ملے جن کے فیصلے قانون کے رسائل و کتب میں رپورٹ ہوئے تھے۔ ان شائع شدہ ۱۰۳ مقدمات کے مختصر کوائف اس کتاب میں حسب ذیل ترتیب سے پیش کر دیے گئے ہیں:

(۱) مقدمہ کا نمبر اور سال (۲) عنوان مقدمہ
(۳) جج کا نام (۴) استغاثہ اور دفاع کے وکلا کے نام
(۵) تاریخ فیصلہ (۶) کیا فیصلہ ہوا؟
(۷) مطبوعہ حوالہ

بیرسٹر اقبال نے اعلیٰ عدلیہ کے جن نامور جج حضرات کے سامنے اپنے موکلین کے حق میں دلائل دے کر کامیابی حاصل کی ان میں سے چند نام یہ ہیں: چیف جسٹس سر آرتھر ریڈ، چیف جسٹس جان سٹون، مسٹر جسٹس بیڈن، جسٹس موتی ساگر، جسٹس شاہ دین،

جسٹس ہیری سن، جسٹس دلیپ سنگھ، جسٹس عبدالقادر، جسٹس بھاٹیہ، جسٹس شادی لال وغیرہ۔

جسٹس شادی لال وہی ''ذات شریف'' ہیں جو بیرسٹر اقبال کی حکومتی اور عوامی پذیرائی پر ہندوانہ تنگ نظری اور تعصب کے تحت جلتے بھنتے رہتے تھے اور ۱۹۲۵ء میں لاہور ہائی کورٹ میں ایک خالی اسامی پر اقبال کی بطور جج تعیناتی تجویز ہوئی تو انہوں نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ''ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ قانون دان کی حیثیت سے نہیں۔''

ظفر علی راجا نے اس موضوع کی مستند معلومات ایک باب میں پیش کر دی ہیں۔ بیرسٹر اقبال پندرہ مقدمات میں جسٹس شادی لال کی عدالت میں پیش ہوئے اور دس مقدمات میں اقبال کے دلائل سے اتفاق کرتے ہوئے ان کے حق میں فیصلے دیے لیکن اقبال کو ہائی کورٹ کی ججی سے محروم رکھنے کے لیے ان کی قانونی قابلیت کے برعکس ذاتی ناپسند اور ہندوانہ تعصب کے تحت بدنیتی سے کام لیا اور سراسر جھوٹ پر مبنی رائے دی۔ اس زیادتی پر قدرت نے یہ سزا دی۔ جسٹس شادی لال آخری عمر میں نابینا ہو گئے اور نہایت کس مپری کے عالم میں ایک قلاش کی حیثیت میں اپنی بیٹی کے گھر پر موت کی لپیٹ میں آ گئے۔ کتاب کا یہ باب علامہ اقبال کے عزم و حوصلے، صبر و ایثار کے علاوہ مخالفین کے غلط پروپیگنڈے کا پامردی سے سامنا کرنے کے نقوش کا آئینہ دار ہے۔

ظفر علی راجا کی اس خوبی کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ انہوں نے اقبال کو ایک ماہر فن قانون دان کی حیثیت میں دریافت کرنے کی سعی کی تو ان کے گرد و پیش کے وکیلانہ ماحول کو بھی پوری اہمیت دی۔ چنانچہ ایک باب میں اقبال کے ہم عصر وکلاء کا تذکرہ کیا تو اقبال کے قانونی حلقۂ احباب میں شامل نامور وکلاء کے مختصر حالات حیات بھی پیش کر دیے۔ ان میں شخصیات میں قائداعظم محمد علی جناح، موہن داس کرم چند گاندھی، مولوی احمد دین، سر عبدالقادر، غلام بھیک نیرنگ، ملک برکت علی، کے۔ ایل گابا، میاں فضل حسین، عبدالقادر قصوری، سر شہاب الدین اور جسٹس شیخ دین محمد شامل ہیں۔ ایک باب بیرسٹر اقبال کے تین منشیوں...... کاہن چند، طاہر الدین اور سید مہتاب شاہ کے حالاتِ حیات کا اجمال پیش کیا گیا ہے۔

ظفر علی راجا نے بیرسٹر اقبال کی خوش طبعی، بذلہ سنجی اور ہر قسم کے موضوع سے مزاح کا زاویہ تراش لینے کی تہذیبی صلاحیت کے تذکرے کے لیے بھی ایک باب مختص کیا ہے۔ شیخ سر عبدالقادر کے بقول ''اعلیٰ درجے کی ظرافت اور ہنسنے ہنسانے کی عادت کے ساتھ ان (اقبال) میں یہ عجیب وصف تھا کہ سنجیدگی اور متانت بیٹھے بیٹھے ظرافت پر غالب آ جاتی تھی'' آخری وصف مزاح پسند لوگوں میں کم کم پیدا ہوتا ہے لیکن اقبال کو قدرت نے اس انفرادیت سے بھی نوازا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال کی مزاح کی رگ، سر شہاب الدین کو...... جن کا قد لمبا، جسم گرانڈیل اور رنگ حد درجہ سیاہ تھا۔ دیکھتے ہی پھڑک اٹھتی اور لطیفوں کی آمد شروع ہو جاتی تھی۔ سر شہاب الدین کو کوئی بات ناگوار گزرتی تو اقبال ہنس کر معذرت کر لیتے۔ ایک لطیفہ ملاحظہ کیجیے:

''بیرسٹر اقبال ایک دن سر شہاب الدین کے گھر ان سے ملاقات کے لیے گئے تو خادم نے بتایا کہ سر شہاب الدین غسل فرما رہے ہیں۔ جب شہاب الدین نہانے کے بعد تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آئے تو اقبال نے مسکراتے ہوئے استقبال کیا اور کہا ''مجھے پتہ چل گیا تھا کہ آپ ہی نہا رہے ہوں گے، کیوں کہ غسل خانے سے جو پانی نکل رہا تھا وہ کالا تھا۔''

کتاب کے آخری باب میں ظفر علی راجا نے رائج اور مجوزہ مضامین پر اقبال کے تبصرے اور تجزیے جمع کر کے اس کتاب کی افادیت میں گراں قدر اضافہ کر دیا ہے۔ چند موضوعات یہ ہیں:

(۱) گو کھلے کا تعلیمی مسودہ قانون (۲) اشتراکی نظریہ اور قوانین (۳) سکندر جناح معاہدہ ۱۹۳۷

(۴) سیاسی جماعتوں کے دساتیر (۵) سر جان سائمن آئینی کمیشن (۶) کمیونل ایوارڈ ۱۹۳۲ء وغیرہ

مجموعی طور پر یہ کتاب اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے کہ مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال کی کثیر الجہات شخصیت میں ان کی قانون دانی نے ایک مخصوص کردار ادا کیا اور اس شعبے میں انہوں نے امتیازی حیثیت حاصل کی۔ ظفر علی راجا نے اقبال کے اعلیٰ اور منفرد قانونی اور اک و ذہانت کو گم شدہ ذخیروں سے تلاش کیا اور اس کے ہر زاویے کو جامعیت سے پیش کیا۔ اقبال کی قانون دانی کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو عشقِ اقبال کے جذبے سے معرضِ وجود میں آئی ہے۔ میں اس کامیاب کاوش پر جناب ظفر علی راجا کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ کتاب کے ناشر فرخ سہیل گوئندی ہیں جو قومی افادیت کی فکر انگیز کتابیں چھاپنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ملنے کا پتہ...... جمہوری پبلی کیشنز، ۲، ر ایوان تجارت روڈ، لاہور

احمد ندیم قاسمی......شعر و ادب کا منفرد قلم کار

ثاقب تبسم ثاقب

ایسے قلم کار کم کم ہوتے ہیں جن کی تخلیقات زندگی، معاشرے اور کائنات کے مربوط فکری نظام کی عکاسی کرتی ہیں۔ وہ فکری و تہذیبی روایت کے ایسے نقوش اجاگر کرتے ہیں جن میں اثر اور خلوص کی تابانی ہوتی ہے۔ ایسے قلم کار جب ایک سے زیادہ ادبی اصناف میں قلم کے جوہر دکھائیں اور ہر صنف کی تخلیق میں فکر و تہذیب کا توازن اور خوبصورتی برقرار رکھیں تو ان کا نام اور کام دونوں زندہ رہتے ہیں۔ ان کی ہر تخلیق میں جمالیاتی حسن، آہنگ اور معاشرتی پہلو کا شاندار امتزاج ان کی پہچان بن جاتا ہے۔ اردو ادب میں ایسے قلم کار انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ملکِ پاکستان کی خوش بختی ہے کہ اللہ تعالی نے ایسی چند شخصیات اس دھرتی پر بھی اتاری ہیں کہ جن کے قلم کی روشنی اردو ادب کے اُفق پر تابندہ رہے گی۔ ایسی ہی ایک نابغہ روزگار شخصیت نے 20 نومبر 1916ء کو وادیِ سُون سکیسر ضلع خوشاب (انگہ) میں جنم لیا۔ دنیائے ادب اس ہستی کو احمد ندیم قاسمی کے نام سے جانتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی ایک ترقی پسند ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستانی روایت کے امین بھی تھے۔ وہ بیک وقت اعلیٰ پائے کے شاعر، منجھے ہوئے افسانہ نگار، حقیقی نقاد، شگفتہ بیاں خاکہ نگار، بہترین مرتب، فکاہی کالم نویس، بچوں کے کہانی کار اور شہرہ آفاق رسائل نقوش اور فنون سمیت درجنوں جرائد کے مدیر اور سب سے بڑھ کر ایک خوبصورت انسان تھے جو ایک ادبی اکیڈمی سا درجہ رکھتے تھے۔ بے شمار معروف ادیب اور شاعر ان کی رہنمائی سے بامِ عروج تک پہنچے۔ احمد ندیم قاسمی کے ادبی و قلمی سفر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ کس قدر تشنہ قلم تھے کہ انہوں نے ادب کی شاید ہی کوئی صنف چھوڑی ہو۔ شان دار بات یہ ہے کہ وہ کسی بھی میدان میں اجنبی اور نئے نہیں لگے۔ ان کے قلم کی گرفت نے کبھی کسی کو موقع ہی نہیں دیا کہ فنی اعتبار سے ان پر کوئی انگلی اٹھائی جا سکے۔ انہوں نے قلم کو اپنا ایمان بنا کر عمر بھر اس کے تقدس کی پاسداری کی۔ ہم نے انہیں جس صورت میں بھی دیکھا، ایک خاص طرح کا ٹھہراؤ، نرمی اور خلوص پایا۔ انہوں نے فکر و فن کی عظمت کو قائم رکھا یہی ان کی برتری ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے افسانے لکھے تو ان میں اپنے معاشرے میں چھپی ہوئی الجھنوں کو خوبصورتی سے نہ صرف اُجاگر کیا بلکہ انہیں سلجھانے کے راستے بھی دکھائے۔ انسانی منفی رویوں کو محبت اور خلوص کی بارش میں نہلایا۔ انسانی زندگی کی دھوپ چھاؤں کو دھنک رنگوں سے سجایا۔ ان کے افسانے حقیقت کا رُوپ ہیں جن میں سنجیدگی اور سچائی ان کے باریک بین اور ہمہ گیر مشاہدے کا نتیجہ ہے۔ گھر سے گھر تک، پت جھڑ، سیلاب، گرداب اور بازارِ حیات ایسے ہی افسانوی مجموعے ہیں جن میں زندگی کی تلخ سچائیاں ادبی چاشنی میں لپٹی نظر آتی ہیں۔ فکر کی یہی تڑپ ان کی شاعری میں تاثیر کا باعث ہے۔ وہ ترقی پسند شاعر اور ادیب مشہور تھے تو اس کی وجہ انسان دوستی اور حب الوطنی بھی ہے۔ عمدہ شاعری کی تمام مروجہ خوبیاں ان کی شاعری میں بکثرت موجود ہیں جس سے ان پر صرف ترقی پسند ہونے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کی شاعری میں فکر کے ساتھ ساتھ فن بھی اپنے عروج پر دکھائی دیتا ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ احمد ندیم قاسمی رومانوی شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ گویا ان کا قلم آل راؤنڈر ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے قلم کو انسان کی عظمت اور اس کے اقبال کے لیے استعمال کیا اسی لیے تو وہ کہتے ہیں کہ ۔۔۔

پڑھتا ہوں جب اس کو تو ثنا کرتا ہوں رب کی
انسان کا چہرہ ہے قرآن کا پارہ

....

میں کسی شخص سے بے زار نہیں ہو سکتا
ایک ذرہ بھی تو بے کار نہیں ہو سکتا

....

اس قدر پیار ہے انسان کی خطاؤں سے مجھے
کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا

احمد ندیم قاسمی کو اپنے لوگوں اور اپنے وطن سے محبت ہے اسی لیے وہ اک دعا محبت کی سرشاری میں ڈوب کر کرتے ہیں جس سے ان کے دل کی بے قراری عیاں ہوتی ہے۔

خدا کرے کہ مرے اک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جُرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو

احمد ندیم قاسمی کی غزل میں نفاست، لطافت، اصلیت، بے ساختگی، جذبے کا سوز و گداز اور فکر کی تپش ہے۔ ان کا لہجہ مضبوط اور توانا ہے۔ وہ شدت پسند نہیں لیکن مصالحاتی کیفیتوں کے قائل بھی نہیں۔ وہ گھلاوٹ اور موسیقیت کے قائل ہیں لیکن

لجاجت اور خوامخواہ کی نزاکت کے خلاف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل امید اور رجائیت کی شاندار نمائندگی کرتی ہے۔ ان کا لہجہ وقار اور تہذیب کے ساتھ شعر کے خوبصورت سانچے میں ہمدردی، سمجھ داری، خودداری اور غیرت مندی کی عکاسی بھی کرتا ہے اور ان کا درس بھی دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں امکان اور امید کی تازگی نکھری بکھری ہے۔

میرا کمالِ فن ہے امکانات کی سیر
ریت پہ بیٹھا پھول بناتا رہتا ہوں

....

ظلمتِ عمر کاٹ دی میں نے یہ سوچ کر ندیم
چادرِ شب میں جابجا تارہیں روشنی کے بھی

....

میں نے جب بوند کے دَر کھول دیئے
سامنے ایک سمندر ہو گا

احمد ندیم قاسمی نے جس انداز میں اپنے سماجی و سیاسی اور معاشی و اجتماعی خیالات کو اپنی فکری و تہذیبی روایت کے ازلی و ابدی سرچشموں سے سیراب کیا ہے، اسے ایک خاص انداز کی روحانی ترقی پسندی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ان کی توحید پرستی، نعت گوئی انقلابیت، حق گوئی و بے باکی، استعمار دشمنی، احساسِ جمال، رجائیت اور پاکستانیت ہماری فکری و تہذیبی روایات کی امین ہیں۔

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

احمد ندیم قاسمی معاملاتِ عشق کو بھی منفرد نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی غزل روح تک کو چُھو لینے والے حُسن اور تہذیب یافتہ معاملاتِ عشق و محبت کا انمول خزانہ ہے۔ ان کے بے شمار اشعار عمدہ شعری تاثیر ، سہلِ ممتنع اور ضرب المثل کی بہترین مثالیں ہیں۔ انہوں نے اردو غزل کے میدان میں نئے آنے والوں کے لیے فکر و اظہار کی صاف ستھری اور نئی راہیں کھول دیں۔

جب میں نے پرستش کی حدوں تک تجھے چاہا
پھر جو بھی حسیں تھا مرے معیار سے کم تھا

....

تُو پکارے تو چمک اٹھتی ہیں میری آنکھیں
تیری صورت بھی ہے شامل تری آواز کے ساتھ

....

مجھ کو اُس شخص کے افلاس پر رحم آتا ہے
جس کو ہر چیز ملی ، صرف محبت نہ ملی

احمد ندیم قاسمی کی کالم نگاری بھی خاصے کی شے ہے۔ ان کی کالموں میں خالص ادبی چاشنی نے ایک ایسا رنگ بھر رکھا ہے جس سے آنکھوں اور دل کے مناظر رنگین اور حسین ہو جاتے ہیں۔ ان کے چُست جملے، مزاح کی کاٹ اور شگفتہ بیانی انہی کا خاصہ ہے۔ شاعری، افسانوں اور کالموں میں ان کے مزاج کا توازن دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے لیکن یہ حیرت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم انہیں بطور نقاد دیکھتے ہیں۔ تنقید ایک بالکل ہی مختلف صنفِ ادب ہے جس میں رعنائی خیال اور جمالیاتی احساس مفقود ہوتا ہے لیکن احمد ندیم قاسمی کے یہاں تنقید کے میدان میں بھی رجائیت اور امید نظر آتی ہے۔ وہ ایک مستند اور منجھے ہوئے نقاد اور محقق کے طور پر بھی اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس میدان میں بھی ان کے قلم نے ان کے مزاج کا ساتھ نبھایا ہے۔ اسی طرح خاکہ نگاری میں بھی ان کا مشاہدہ بے مثال ہے۔ انہوں نے خاکہ نگاری میں بھی اپنے فن کو ان قدروں کا ترجمان بنایا جن کی بقا پر انسانیت کے حال و مستقبل کا انحصار ہے۔ ان کی کسی بھی تخلیق میں مصلحت نظر نہیں آتی۔ وہ ایک بہترین حق گو اور حق شناس قلم کار ہیں۔ انہوں نے ہر صنف میں جرات فکر و اظہار سے کام لیا اور وہ عمر بھر شعر و ادب کے ذریعے امید و جستجو کے اَن گنت امکانات سے وابستہ رہے۔ انہوں نے عمر بھر ادب کی خدمت کو زندگی کا وظیفہ بنائے رکھا اور مستقل مزاجی سے اپنے راستے پر گامزن رہے۔ بلا شبہ ان کے قلم نے اردو ادب کو توانائی اور تونگری بخشی ہے۔ ان کا قلم، قلم نہیں ایک تحریک ہے جس نے احمد شاہ کو احمد ندیم قاسمی بنا دیا۔ اردو ادب میں اس عظیم قلم کار کا نام ہمیشہ پہلی صفوں میں نمایاں رہے گا اور اس کے قلم سے کھلے ہوئے لفظوں کے پھول ہمیشہ مہکتے رہیں گے۔

حکم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے ندیم
زخم کو زخم نہیں پھول بتایا جائے

اعزازات:

احمد ندیم قاسمی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں بیسیوں ایوارڈز سے نوازا گیا۔ انہیں 1963ء میں پہلی بار ''دشتِ وفا'' پہ آدم جی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1976ء میں ''محیط'' اور پھر 1979ء میں ''دوام'' کو بھی یہ عظیم ادبی ایوارڈ ملا۔ 1968ء میں انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس کا سول اعزاز اور پھر حکومتِ پاکستان کی جانب سے ''ستارہ امتیاز'' جیسے وقیع اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

نام اور شکلیں

عطاء الحق قاسمی

میں آج اپنے ان تمام دوستوں سے معذرت چاہتا ہوں جنہیں میں بوقت ملاقات پہچان نہیں پاتا، یہ دوست سمجھتے ہوں گے شاید ایسا کسی غرور کی وجہ سے ہے حالانکہ اس کی وجہ صرف حافظے کی کمزوری ہے!

جن دوستوں سے میں معذرت کا طلب گار ہوں ان میں سے کچھ تو ٹیلی فون پر میرے حافظے کا امتحان لیتے ہیں، ان سے مکالمے کی نوعیت کچھ یوں ہوتی ہے........

''ہیلو! قاسمی صاحب؟''

''جی بول رہا ہوں''

''اخاہ! حضرت کیا حال ہیں، آپ سے تو اب ملاقات ہی نہیں ہوتی، کہاں غائب ہیں؟''

''کہیں نہیں! اسی شہر میں ہوں''

''آپ کے لہجے میں مجھے اپنائیت نظر نہیں آرہی، لگتا ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟''

''آپ صحیح کہتے ہیں! میں واقعی نہیں پہچان سکا، آپ براہ کرم اپنا تعارف کرائیں گے''

''اب مجھے اپنا تعارف بھی کرانا پڑے گا؟ مگر یقین کریں ایسا نہیں ہوگا، آپ کو پہچاننا پڑے گا''

''میں ایک بار پھر معافی کا طلب گار ہوں، میرے لیے یہ آواز بالکل نئی ہے''

''قاسمی صاحب! بہت افسوس کی بات ہے، پہلے تو مجھے صرف شک تھا اب یقین ہے کہ آپ مغرور ہوگئے ہیں، خیر ہوتا ہے ایسا، میں عبدالقدوس بول رہا ہوں''

''آپ کو حق پہنچتا ہے کہ اب مجھے آپ باقاعدہ برا بھلا کہیں، مگر معاف کیجئے کون عبدالقدوس؟''

''اس کے بعد میں آپ سے کیا بات کروں، بہر حال آپ کو اگر یاد ہو تو آپ 1974ء میں یونیورسٹی ہاسٹل میں اپنے دوست اختر سے ملنے آیا کرتے تھے؟''

''تو یوں کہو نا کہ تم اختر ہو، یہ عبدالقدوس کب سے ہوگئے؟''

''نہیں! میں اختر نہیں ہوں! میں عبدالقدوس ہوں، میں بھی اسی ہاسٹل میں رہتا تھا، وہاں ایک دفعہ نہیں دو تین دفعہ آپ سے ملاقات ہوئی تھی، اب آپ بڑے آدمی ہوگئے ہیں، ہم غریبوں کو کہاں پہچانیں گے؟''

میں اس جملے پر خوش ہو جاتا ہوں کہ ''آپ بڑے آدمی ہیں'' چنانچہ لہجے میں مصنوعی بے تکلفی پیدا کر کے انہیں پہچاننے کا دعویٰ کرتا ہوں، یہی نہیں بلکہ انہیں گھر آنے کی دعوت بھی دیتا ہوں اور معذرت بھی کرتا ہوں کہ صرف تیس سال کے قلیل عرصے میں دو تین کثیر ملاقاتوں والے عزیز دوست کی آواز نہیں پہچان سکا!

ان صاحب سے بھی زیادہ عزیز اور قریبی دوست تو وہ تھے جن سے گزشتہ روز سر راہے ملاقات ہوئی، وہ مجھے دیکھتے ہی تیر کی طرح میری طرف لپکے اور انہوں نے مجھے ''جن جپھا'' مارتے ہوئے اتنے زور سے بھینچا کہ مجھے لگا جیسے میرے حالیہ آپریشن کے ٹانکے کھلنے والے ہیں۔ انہوں نے میرے چہرے پر جوابی گرمجوشی کے آثار کے بجائے تکلیف کے آثار دیکھے تو بولے ''معافی چاہتا ہوں! میں بھول گیا تھا کہ ایک پرانے نیاز مند کو ایک بڑے آدمی سے کس طرح ملنا چاہئے!''

میں نے کہا ''بڑے آدمی تو آپ ہیں جو اپنے جیسے ایک انسان کو اتنی گرمجوشی سے مل رہے ہیں، میں نے تو چھوٹا آدمی ہونے کا ثبوت دیا ہے کہ اس گرمجوشی کی ذرا سی تکلیف برداشت نہیں کر سکا!''

اس پر وہ صاحب خوش ہوئے اور بولے ''یہ تو آپ نے صحیح ارشاد فرمایا، اب آپ یہ بتائیں آپ نے مجھے پہچانا!'' میں نے کہا ''نہیں''

اس پر وہ مغموم ہوگئے کہنے لگے ''ابھی کل آپ سے ملاقات ہوئی ہے، آپ محمود بوٹی میں میاں یعقوب صاحب کے بھائی کے قلوں پر آئے تھے، وہاں آپ نے حاضرین کو مخاطب کر کے ''السلام علیکم'' کہا تھا۔ میں نے بھی دوسروں کے ساتھ جواب میں ''وعلیکم السلام'' کہا تھا''

یہ پہچاننے اور نہ پہچاننے والا عمل صرف میرے ساتھ نہیں، بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، میرے ایک شاعر دوست کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا وہ میں پہلے بھی کہیں بیان کر چکا ہوں، اسے یہاں دہرانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، انہیں اسی طرح ایک صاحب بہت گرمجوشی سے ملے، جوابی سرد مہری دیکھ کر وہ پریشان ہوگئے اور پوچھا ''آپ نے پہچانا نہیں؟'' دوست نے جواب دیا ''نہیں'' بولے ''آج سے پچیس سال پہلے کوٹ ادو میں ایک مشاعرہ ہوا تھا آپ نے بھی اس میں شرکت فرمائی تھی، وہاں میں نے آپ کو ایک شعر پہ داد دی تھی'' میرے شاعر دوست نے یہ واقعہ سنا کر رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا ''برادر وہ شخص گلے میں بالکل حق بجانب ہے پوری زندگی میں ایک ہی شخص نے تو تمہیں داد دی اور تم اسے بھی بھول گئے''

اور آخر میں یہ کہ واقعی کمزور حافظے کا مالک ہوں اگر بوقت ملاقات مجھے کسی دوست کا نام یاد نہ آئے تو اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، دراصل مجھے شکلیں یاد رہ جاتی ہیں نام یاد نہیں رہتے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اب شکلوں جیسے نام نہیں رہے اور ناموں جیسی شکلیں آنا بند ہوگئیں ہیں۔

عشق کا ''لام''

گل نوخیز اختر/لاہور

ویسے تو عشق کرنے کی کوئی عمر نہیں لیکن 18 سے 25 سال تک کی عمر میں ہر کوئی عشق کرتا ہے اور یہ خواب بھی لازمی دیکھتا ہے کہ وہ ایک بحری جہاز پر سوار ہے۔ اچانک سمندر کی تیز لہروں کے نتیجے میں جہاز تباہ ہو جاتا ہے لیکن صرف وہ اور ایک خوبصورت دوشیزہ سلامت بچتے ہیں اور ایک جزیرے پر زندگی گزارتے ہیں۔ جوانی میں یہ خواب تواتر سے آتا ہے جبکہ چالیس سال کے بعد اسے ذاتی کوشش سے دیکھنا پڑتا ہے۔ عشق مختلف طریقوں سے ہوسکتا ہے۔ ایک عشق وہ ہوتا ہے جو پہلی نظر میں ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ عشق فیس بک پر بکثرت دیکھا جاسکتا ہے۔ ادھر کسی خوبصورت لڑکی نے پوسٹ لگائی۔ ادھر سینکڑوں عشاق کے قافلے وال پر پہنچنا شروع ہو گئے۔ لڑکی سے عشق کرنے کیلئے سب سے ضروری چیز لڑکی ہے۔ باقی ہر چیز ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ لڑکیاں فیس بک کی جس پوسٹ پر بھی ہاتھ ڈالیں وہ سونا بن جاتی ہے۔ پچھلے دنوں ایک محترمہ نے اپنے سٹیٹس پر تازہ غزل کا شعر لکھا کہ!

تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو
آخر کیا وجہ ہے کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو

عشاق نے فوراً اس کا نوٹس لیا اور دس منٹ کے اندر اندر موصوفہ تین سو پینسٹھ Likes سمیٹ گئیں۔ کمنٹس پر نظر ڈالی تو اکثریت کی مشترکہ رائے تھی کہ اتنا خوبصورت شعر کہنے پر شاعرہ کو ''نشان حیدر'' ملنا چاہیے۔ کئی ایک نے حکومت کو بھی گالیاں دیں کہ میٹرو بنانے کے بجائے اس شاعرہ کی طرف دھیان دو۔ شاعرہ نے جواب میں لکھا ''میرے لیے کسی ایوارڈ کی کوئی حیثیت نہیں، آپ سب کی محبتیں ہی میرا اعزاز ہیں، سلامت رہیں''۔

ہمارے ہاں عاشق کیلئے میٹرک میں فیل ہونا بہت ضروری ہے، تاریخ گواہ ہے کہ جو بھی عاشق میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہوا، عشق میں فیل قرار پایا۔ عاشق کو دنیا سے کیا مطلب؟ جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا؟؟؟ یہ ٹھیک ہے کہ عاشقی صبر طلب ہوتی ہے لیکن برصغیر کا عاشق بہت بے صبرا واقع ہوا ہے۔ جو بھی عاشق محبوب کو اس قسم کے شعر سنائے کہ ''محبت بندگی ہے اس میں تن کا قرب مت مانگو..... کہ جس کو چھو لیا جائے اسے پوجا نہیں کرتے'' سمجھ جائیں کہ بکواس کر رہا ہے اور کوئی سنہری موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔ وہ زمانے گئے جب عاشق اپنے محبوب کی خاطر نہریں کھودا کرتے تھے آج کا عاشق نہ کھود سکتا ہے نہ سوچ سکتا ہے۔

پرانے وقتوں میں عاشق اپنے محبوب کے عشق میں ڈوب کر دیوانے ہو جایا کرتے تھے۔ مجنوں بن جاتے تھے، کھانا پینا بھول جاتے تھے لیکن آج کا عاشق محبوب کا التفات حاصل کرنے کیلئے بیوٹی پارلر جاتا ہے، فیشل کرواتا ہے، کانوں میں بالی پہنتا ہے..... خدا گواہ ہے ایسے عاشقوں کو دیکھ کر اکثر احساس ہوتا ہے کہ یہ عاشق نہ ہوتے تو یقیناً معشوق ہوتے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ عاشق ہمیشہ کوئی مرد ہی ہوتا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ عاشق کی مونث کیا ہے۔ ویسے بھی لڑکیوں کو عاشق کہنا مساعی جمیلہ کی توہین ہے کیونکہ عاشق کے لفظ سے مونچھیں جھلکتی ہیں یہ صرف مردوں پر ہی جچتا ہے۔ لڑکیاں عموماً عشق وغیرہ نہیں فرماتیں کیونکہ انہیں پتہ ہوتا ہے کہ وہ جس طرف بھی انگلی اٹھائیں گی پروانے قطار اندر قطار دوڑے چلے آئیں گے۔ عشق مجازی کا یہی مزا ہے کہ پانچ سو انار اور پانچ ہزار بیمار ہوتے ہیں۔

عشق تین حروف کا مجموعہ ہے ''عین، شین اور قاف''۔ عین کا مطلب ہے عقل سے عاری..... شین کا مطلب شرم سے عاری اور قاف کا مطلب ابھی میرے ذہن میں نہیں آ رہا، کاش یہ قاف قینچی والا نہ ہوتا۔ میرے خیال میں عشق میں ایک ''لام'' بھی ہوتا ہے لیکن عموماً لکھا اور پکارا نہیں جاتا، بالکل پیزے کی طرح جس میں ایک "T" بھی ہوتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے۔ عشق کا لام بھی عموماً ''میوٹ'' رہتا ہے اور اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب عاشق کی انگریزی میں سپلی آتی ہے یا رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ وہ جوانی جوانی نہیں جس میں کوئی کہانی نہ ہو...... جن لوگوں کی زندگی عشق سے عاری گزری ہے وہ بھی کوئی نہ کوئی گھڑ ہی لیتے ہیں اور اس کہانی کا انجام عموماً ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ میں نے اپنے آنسو چھپالیے تاکہ اس کا شوہر نہ دیکھ لے، پرانی فلموں میں ناکام عاشق اپنی محبوبہ کے شوہر کے سامنے پیانو پر ''اک ایسی لڑکی تھی جسے میں پیار کرتا تھا'' گایا کرتے تھے اور پوری دیدہ دلیری سے بار بار محبوبہ کی آنکھوں میں جھانکتے تھے۔ محبوبہ بھی دل گرفتہ نظر آتی تھی لیکن سوہر صاحب کے کان پر نہ صرف جوں تک نہیں رینگتی تھی بلکہ بعض اوقات تو وہ اپنی بیگم صاحبہ کے عاشق کو اچھی آواز پر داد بھی دیتے نظر آتے تھے۔

عشق کے بارے میں مشہور ہے کہ عشق نہ ذات پوچھتا ہے نہ محل منارے، بالکل ٹھیک ہے عشق صرف بینک اکاؤنٹ پوچھتا ہے۔ عاشق اگر امیر ہو تو عاشقی اور عاشی دونوں بغیر تگ و دو کے حاصل ہو جاتی ہیں لیکن غریب عاشق سوائے اپنے موبائل میں مکیش کے گانے سننے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ نے اکثر ہینڈ فری کانوں سے لگائے ایسے لڑکے دیکھے ہوں گے جو رات کو محلے کی گلیوں میں گھومتے ہوئے خود کلامی کرتے اور مسکراتے نظر آتے ہیں۔ یہ انجام سے بے خبر وہ عاشق ہوتے ہیں جنہیں یقین ہوتا ہے کہ شکیلہ ان پر مرمٹی ہے۔ یہ اپنا نیٹ ورک بھی شکیلہ کے نیٹ ورک پر لے آتے ہیں اور پھر ''گھنٹہ پیکج'' کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق عبادت ہوتا ہے لہٰذا یہ عبادت کے دوران گھر سے آنے والی کوئی کال سننا گناہ سمجھتے ہیں۔ یہ ساری ساری رات شکیلہ کو محبت کی تھیوری اور پریکٹیکل سمجھاتے ہیں تاہم کئی مقامات پر شکیلہ کو ان کی تصحیح کرنا پڑتی ہے۔ کسی سیانے نے کہا تھا کہ عشق ضرور کرنا چاہئے یہ آپ کا پیدائشی حق ہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن ایک احتیاط لازم ہے کہ بیوی کو بالکل نہ پتہ چلے ورنہ عشق کا لام اچانک بلند آواز ظاہر ہوسکتا ہے۔

شاذیہ اکبر اور اُس کی شاعری

جمیل یوسف/مری

یہ ۲۰۱۴ء کی بات ہے۔ آزاد کشمیر کے مرحوم صدر اور مجاہدِ اول محترم سردار عبدالقیوم خان کے عالم فاضل فرزند ارجمند اور سابق وزیرِاعظم آزاد کشمیر جناب سردار عتیق احمد خان نے اپنے عظیم باپ کی برسی کے موقعہ پر اپنے آبائی قصبے نیلہ بٹ (آزاد کشمیر) میں سہ روزہ تقریبات کا اہتمام کیا۔ ان تقریبات کے آخر میں ایک مشاعرے کا پروگرام بھی تھا۔ راولپنڈی اسلام آباد سے روزنامہ نوائے وقت کے ادبی ایڈیشن کی مدیرہ محترمہ عائشہ مسعود، نعت نگینے کے خالق ممتاز شاعر جناب نسیم سحر، وفا چشتی، انجم خلیق، راشد متین اور راقم الحروف کو اس مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ ہم بذریعہ ویگن دریائے جہلم پر کوہالہ پل کو عبور کر کے مظفر آباد کی طرف جانے کے بجائے اس کے بالکل اُلٹی طرف جانے والی سڑک پر ہو لیے۔ چند کلومیٹر کے بعد ہم مشرق کی جانب پہاڑ کے اوپر چڑھتی ہوئی ایک ذیلی سڑک کی طرف مڑے جو مسلسل بل کھاتی ہوئی پہاڑ کی فلک بوس چوٹی کی جانب اُٹھ رہی تھی۔ سڑک کی ناہمواری اور خستگی سفر کی خطرناکی میں اضافہ کر رہی تھی۔ پہاڑ پر چڑھائی چڑھنے سے پہلے ہم آپس میں بڑی دلچسپ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ جس طرح مشاعرے پر جاتے ہوئے شاعروں میں اکثر ہوتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کے مختلف واقعات اور لطیفوں سے ہم خوش وقت ہو رہے تھے۔ مگر مسلسل بلندی کی طرف اُٹھتی ہوئی ناہموار سڑک نے گفتگو کو درہم برہم کر دیا اور ہم سڑک کے اطراف کی ہیبت ناکی کا خاموش مشاہدہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سڑک میں بل پڑتا اور وہ پہاڑ کی بلندی کی طرف مزید زقند بھرتی۔ ہچکولے کھاتی ہوئی ویگن میں سیٹ بیلٹ کی سہولت سے محروم ہم دل ہی دل میں یا حفیظ کا ورد کرتے ہوئے راستے پر نظریں جمائے خاموشی سے سڑک کے ہر اگلے موڑ کی جانب توجہ مبذول کیے بیٹھے تھے۔ میرے ذہن میں غالب کا یہ شعر انگڑائی لے رہا تھا:

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی بلندی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

آخر خدا خدا کر کے ہم پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے اور ہمیں نیلہ بٹ کی دو خوبصورت عمارتیں دور سے استقبال کے لیے ایستادہ نظر آئیں۔ ایک گیٹ سے ہماری ویگن عمارت کے احاطے میں داخل ہوئی تو وہاں موجود مشاعرے کے منتظمین اور نیلہ بٹ کے معززین نے ہمارا استقبال کیا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ گرم گرم چائے اور لذیذ پکوڑوں سے ہماری خاطر مدارات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ عمارت نیلا بٹ کے کسی متمول شخص نے جو انگلستان کا باسی تھا، مہمانوں کے قیام کے لیے بنا رکھی تھی۔ وہ خود تو بیرونِ ملک مقیم تھا مگر اپنے آبائی گاؤں یا قصبے میں اس کا تعمیر کردہ مہمان خانہ اس کی مہمان نوازی اور عالی ظرفی کی گواہی دے رہا تھا۔ کوئی بھلا سا نام تھا اس کا کوئی عباسی صاحب، جو ہمیں بتایا گیا۔ مگر اب اتنا عرصہ گزرنے کے بعد ذہن سے اُتر گیا ہے۔

شام گہری ہونے لگی تو آسمان پر آخری تاریخوں کا چاند جگمگانے لگا۔ اس سرسبز و شاداب پہاڑی پر درختوں کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے نیلہ بٹ پر چاندنی یوں رقص کر رہی تھی کہ منظر کی دل کشی نے ایک نشہ سا طاری کر دیا۔ میرے لبوں پر بے ساختہ ناصر کاظمی کا شعر مچلنے لگا:

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اسی کو چوم لیا

عشائیے کے بعد مہمان شعراء کو مشاعرہ گاہ پہنچایا گیا۔ یہ جگہ نیلہ بٹ سے نیچے کی طرف بل کھاتی ہوئی سڑک پر تقریباً ڈیڑھ دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ یہ کسی پبلک پارک کے باغ کا صحن معلوم ہوتا تھا جہاں زمین پر بچھی ہوئی چاندنی پر نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک چاندنی تو سفید چادروں سے منتظمین نے زمین پر بچھائی ہوئی تھی۔ دوسری زیادہ روشن اور چمکتی ہوئی چاندنی سورج کی طرح جگمگاتا چاند مشاعرہ گاہ اور اردگرد کے سارے خواب گوں ماحول پر نچھاور کر رہا تھا۔ محسوس ہوتا تھا ہم نیلہ بٹ میں نہیں بلکہ کوہِ قاف کی کسی طلسمی وادی میں آ نکلے ہیں۔ مشاعرہ گاہ میں داخل ہوتے وقت دائیں طرف نظر پڑی تو زرق برق لباس میں ملبوس چار پانچ خوبصورت خواتین دکھائی دیں۔ ان میں ایک چہرہ اتنا روشن اور گلاب کی طرح کھِلا ہوا تھا کہ میرے ذہن میں ابن انشاء کا شعر گنگنانے لگا:

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ ترا

میرے قدم کشاں کشاں اس گُل دستۂ حُسن و

جمال کی طرف بڑھنے لگے۔ جوگل سرسبد تھا اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ میں نے بغیر کسی تعارف اور تکلف کے پوچھا ''یہ کون سی کتاب ہے؟''

موسیقی بکھیرتی ہوئی ایک مترنم آواز کانوں میں رس گھول گئی ''یہ میرا مجموعہ کلام ہے''

''اچھا تو آپ شاعرہ ہیں۔ ماشاءاللہ! کیا نام ہے؟

''شاذیہ اکبر''

یہ نام تو سنا ہوا تھا مگر شاذیہ اکبر کو دیکھا نہیں تھا۔ اس وقت اس قول کی صداقت کا کا پتہ چلا ''شنیدہ کے بود مانند دیدہ''۔ یعنی جس نے صرف سُن رکھا ہو وہ اس کی برابری کیسے کر سکتا ہے جس نے دیکھا ہو۔ یہ شاذیہ اکبر کا حُسن تھا یا ماحول کا جادو کہ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا ''تو آئیں یہاں کیوں کھڑے ہیں آپ لوگ؟''

شاذیہ نے کہا ہم آپ کی آمد کا انتظار کر رہی ہیں (یعنی مہمان شعرا کی آمد کا)۔ میں نے شاذیہ سے پوچھا ''آپ آزاد کشمیر کی ہیں؟''

کہنے لگیں ''نہیں جی میں پنجابی ہوں اور اسلام آباد میں رہتی ہوں۔''

میرے ہونٹوں پر پھر ایک سوال آ گیا ''وہاں کیا کرتی ہیں؟''

کہنے لگیں ''اسلام اباد کے ایک ٹیچرز ٹریننگ کالج میں بطور سینئر ماہر مضمون اردو کام کرتی ہوں اور اساتذہ کو ٹریننگ دیتی ہوں ہوں۔''

''آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟''

''جی میں پہلے سے یہاں آئی ہوئی ہوں۔ یہاں خواتین اساتذہ کا ایک سیمینار اور سپورٹس فیسٹیول تھا، میں اس میں بھی مدعو تھی۔ بلکہ اس کے منتظمین میں سے ہوں۔

''ماشاءاللہ'' میں نے کہا۔

میں بلا ارادہ ایک بےخودی کے عالم میں جہاں خواتین جا کر بیٹھیں وہیں جا پہنچا۔ بلکہ شاذیہ کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ مشاعرے کے منتظمین مجھے مرکزی جگہ پر بیٹھنے کی دعوت دے رہے تھے۔ مگر میں شاذیہ میں محو تھا۔ اس کی باتیں سننا چاہ رہا تھا۔

تو مخاطب بھی ہے، قریب بھی ہے
تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں

مشاعرے کے اختتام پر جب سامعین منتشر ہوئے اور شعراء مہمان خانے کو واپسی کے لیے اُٹھے تو شاذیہ نے خدا حافظ کہا اور اپنی ساتھیوں کے ساتھ ہجوم میں گم ہو گئی۔ مہمان خانہ پہنچ کر ہم نے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی۔

میں کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ ایک اور صاحب بھی آ دھمکے۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا کہ ''وہ آزاد کشمیر گورنمنٹ میں سیکرٹری ہیں۔ سردار عتیق احمد خان سے تعلق خاطر ہے۔ اس لیے بطور خاص ان کے والد مرحوم کی تقریبات میں شرکت کے لیے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے آئے ہیں۔

میں نے اُن سے پوچھا کہ مشاعرے میں جو خواتین شریک تھیں وہ کہاں ٹھہری ہیں۔ اُنہوں نے بتایا ''قریب ہی ایک ریسٹ ہاؤس ہے، ان کا قیام وہاں ہے۔''

ہم دونوں رات گئے تک مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے رہے۔ سیکرٹری صاحب نے بتایا کہ وہ پیر بھی ہیں اور ایک معروف روحانی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں۔ آزاد کشمیر کی علمی، ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کے نگران ہیں۔ آزاد کشمیر آرٹس کونسل کے مدارالمہام ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ان کے پاس بڑی آرام دہ سرکاری گاڑی ہے اور وہ صبح اسلام آباد جا رہے ہیں۔ انہوں نے ازراہ کرم مجھ سے کہا کہ میں ویگن میں دھکے کھانے کی بجائے کل صبح ان کے ساتھ چلوں، سفر اچھا گزرے گا۔ گپ شپ رہے گی۔ میں نے اس مہربانی پر ان کا شکریہ ادا کیا اور شب بخیر کہہ کر کروٹ بدل لی۔

صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ مہمان خانے کے ملازم نے دروازے پر دستک دی اور بتایا کہ ساڑھے آٹھ بجے ناشتے کے لیے آ جائیں۔ میرے روم میٹ یعنی سیکرٹری صاحب بہادر ناشتے کی میز پر پہنچے تو کئی ساتھی پہلے سے موجود تھے۔ سامنے شاذیہ اور ایک اور خاتون بیٹھی تھیں۔ سیکرٹری صاحب کو جن کو پیرزادہ لکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اتفاق سے شاذیہ کے بالکل بالمقابل خالی نشست ملی۔ وہ آگے قدم بڑھا کر وہاں جا براجمان ہوئے۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سلام دعا کے بعد میں نے شاذیہ کے پہلو میں جلوہ افروز خاتون سے کہا ''رات آپ نے مشاعرے میں اپنا کلام نہیں سنایا۔''

وہ کہنے لگیں ''میں شاعرہ نہیں ہوں'' شاذیہ بول اُٹھیں۔ ان کی شیریں اور مترنم آواز کی خوشبو فضا میں بکھری۔ انہوں نے بتایا ''یہ میری کولیگ ہیں۔ سپورٹس فیسٹیول میں بچوں کے ساتھ شرکت کے لیے آئی ہیں۔''

اب پیرزادہ صاحب گویا ہوئے...... شاذیہ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ اپنے اعلیٰ عہدے

کا ذکر کیا۔ پیرزادگی کا بتایا اور رات کے مشاعرے میں شاذیہ اکبر کی غزل کی تعریف کی۔ شاذیہ نے مسکراتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر وہ پوچھنے لگے ''آپ اسلام آباد میں کیا کر رہی ہیں؟''

شاذیہ نے ان کو بتایا ''میں ایک کالج میں پڑھاتی ہوں اور اسی کالج میں رہتی ہوں۔''

''کہاں ہے آپ کا کالج؟'' پیرزادہ صاحب نے پوچھا۔

شاذیہ نے بتایا ''نمل یونیورسٹی کے پاس''۔

میرے سامنے نسیم سحر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے بائیں جانب وفا چشتی اور ساتھ عائشہ مسعود صاحبہ۔ میں ان کا حال احوال پوچھنے لگا۔ معلوم ہوا کہ ناشتے کے فوراً بعد واپسی کا پروگرام ہے۔ شاذیہ اور ان کی کولیگ اپنے ریسٹ ہاؤس سے اُٹھ کر ہمارے ساتھ ناشتے میں آ بیٹھی تھیں ان کا ارادہ بھی ہمارے ساتھ ویگن میں جانے کا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر پیرزادہ صاحب اور میں اپنے کمرے میں آئے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دے رکھی تھی اس لیے میں نے ان سے پوچھا کہ ان کا ارادہ کس وقت نکلنے کا ہے۔ کہنے لگے ''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کی جگہ شاذیہ اکبر کو اپنی کار میں بٹھا کر لے جاؤں؟''

میں بولا ''ضرور میں تو اپنے شاعر دوستوں کے ساتھ جانے کو ترجیح دوں گا۔ کیا آپ نے شاذیہ سے بات کر لی ہے۔ وہ آپ کے ساتھ جائیں گی؟''

کہنے لگے ''کیوں نہیں۔ وہ کار میں جانا پسند کریں گی۔''

میں اپنا بیگ اُٹھا کر اور پیرزادہ صاحب کو خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکلا اور لاؤنج کی راہ لی۔ وہاں اپنا اپنا زادِ سفر لیے باقی دوست بھی آ چکے تھے۔ شاذیہ اور ان کی ساتھی بھی بیٹھی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پیرزادہ صاحب بھی نمودار ہوئے اور شاذیہ کے پاس جا کر غالباً ان سے اپنا مدعا بیان کرنے لگے۔ میں نسیم سحر اور وفا چشتی کے ساتھ کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا اس لیے ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ شاذیہ اور پیرزادہ کے درمیان کیا گفتگو ہوئی۔

میں نے دیکھا کہ شاذیہ سے گفتگو کرنے کے بعد موصوف میری طرف آ رہے ہیں۔ مجھے ہاتھ کے اشارے سے ایک جانب بلایا اور فرمایا ''شاذیہ میرے ساتھ نہیں جا رہی۔ آپ چلیں۔''

میں نے ان سے کہا ''میں معذرت خواہ ہوں۔ میں دوستوں کے ساتھ جانا چاہوں گا جن کے ساتھ آیا ہوں۔''

واپسی پر ویگن میں اب یہ تو مجھے یاد نہیں کہ میرے ساتھ سیٹ پر کون بیٹھا تھا مگر اس یاد کا نقش اب تک روشن ہے کہ اگلی سیٹ پر دائیں ہاتھ عائشہ مسعود اور بائیں ہاتھ شاذیہ اکبر تشریف فرما تھیں۔ ان دونوں خواتین کے ملبوسات کا رنگ اور خوشبو مشامِ جاں کو معطر کر رہی تھی۔ اقبال نے کیا سچ کہا ہے: ؎ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

ویگن واپسی پر اُترائی میں چڑھائی کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے بھاگ رہی تھی اور گھاٹیوں کی خطرناکی میں اضافہ کر رہی تھی۔ میں ہر موڑ پر ڈرائیور سے بار بار کہہ رہا تھا کہ بھائی آرام سے چلو، آہستہ چلو، کوئی جلدی نہیں۔ جوش کا یہ شعر بھی اُسے ایک سے زیادہ بار سنایا:

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ انساں سخت ناہموار ہے ساقی

سطحِ ذہنِ انسان سے کہیں زیادہ ہمیں اس وقت سڑک کی تنگ دامانی اور ناہمواری کی فکر لاحق تھی۔ میں نے اسی ترنگ میں عدم کا یہ شعر بھی پڑھ دیا:

؎ سوچ لو راہ میں مجھ کو نہ پریشاں کرنا
راستہ زیست کا کہتے ہیں کہ ہموار نہیں

کسی نے کہا ''آپ کو شعر بڑے یاد ہیں''

میں نے بے ساختہ جواب دیا ''شعروں کے علاوہ اور کچھ یاد نہیں۔ زندگی بھر شعر و شاعری کے علاوہ اور کوئی کام توجہ سے کیا ہی نہیں۔ بس یہی دھن رہی کہ ''محفلِ شعر رہے گرم چلے دورِ غزل'' عابد علی عابد نے کہا تھا:

گردشِ جام نہیں رک سکتی
جو بھی اے گردشِ دوراں گزرے

میں کہتا ہوں:

گردشِ شعر نہیں رک سکتی
جو بھی اے گردشِ دوراں گزرے

میرا ایک شعر ہے:

ہنوز لشکرِ غم سے نجات ممکن ہے
نشاطِ شعر کا کیفِ دوام باقی ہے

عدم کا ذکر چل نکلا۔ ہمیشہ کی طرح ذکرِ عدم پر میں نے کہا۔ عدم بہت بڑا شاعر تھا۔ پوری اردو شاعری میں اس کا جواب نہیں۔ میرے اس دعوے سے کسی نے اختلاف کیا تو میں نے پے در پے عدم کے اشعار سنانے شروع کر دیے اور انہی مطالب و معانی کے دوسرے شاعروں کے اشعار تاکہ عدم کی برتری واضح ہو۔ میں عدم کو مسرت و انبساط کی دولت

بانٹنے والا شاعر کہتا ہوں یہ عدم کے اس طرح کے اشعار زبان پر آتے رہے۔

سفر طویل ہے کچھ زادِ راہ لے جاؤ
کسی فقیر کی کامل نگاہ لے جاؤ
مبادا داورِ محشر تمہیں نہ پہچانے
ہمیں بطورِ ثبوت و گواہ لے جاؤ

ویگن میں جو پانچ چھ مرد حضرات تھے وہ تو آپس میں کچھ نہ کچھ گفتگو کرتے رہے مگر جو دو خواتین میرے سامنے اگلی سیٹ پر بیٹھی تھیں وہ بالکل خاموش رہیں۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ یہ زندگی میں غالباً پہلا موقع تھا کہ میں نے تین گھنٹے کے لگ بھگ دو عورتوں کو اکٹھے بیٹھے ہوئے دیکھا جو بالکل خاموش تھیں۔ بعد میں میری اس حیرت کے جواب میں شاذیہ نے بتایا کہ ''مجھے تو وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ آپ کی باتیں اور اشعار سننے میں محو رہی۔'' ہوسکتا ہے عائشہ مسعود کا بھی یہی حال ہو۔ ان سے اس موضوع پر میری بات نہیں ہوئی۔ ایک اور بات بھی ہے اگر خواتین صحیح معنوں میں پڑھی لکھی ہوں اور پھر شاعرہ اور ادیبہ بھی ہوں تو شاید خاموش رہ سکتی ہوں یا اگر ایک دوسرے سے مزاج نہ ملتے ہوں۔ بہرحال میں خاصا بولتا رہا۔ شعر و شاعری سے متعلق کسی سوال کے جواب میں کبھی مختلف مشہور شعراء پر رائے زنی میں اور زیادہ تر شعر سنانے میں لگا رہا۔ اپنے نہیں، دوسروں کے۔ مجھے اکثر شاعروں کی طرح اپنے شعر سنانے کا مرض لاحق نہیں۔ موضوعِ گفتگو پر ہی بات کرتا ہوں۔

مری کے قریب پہنچ کر ہم سرِ راہ ایک چائے خانے پر رکے اور چائے اور پکوڑوں سے اپنی تواضع کی۔ اس دوران میں نے شاذیہ سے پوچھا کہ صبح ناشتے کے وقت اُس سیکرٹری نے جو اپنے آپ کو پیرزادہ بھی بتاتا تھا، آپ سے کیا بات کی تھی۔ وہ ہنسنے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ میرے پاس آ کر اس نے بے تکلف ہوتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو بتایا اور یہ بھی کہا کہ اس کے پاس بڑی آرام دہ کار ہے۔ میں نے اس سے معذرت کر لی اور کہا کہ ''میں ویگن میں جاؤں گی۔''

شاذیہ اکبر نے بعد میں مجھے بتایا کہ اُس پیر زادے نے کچھ دنوں بعد دو تین بار ملنے کی کوشش کی اور آخر ڈانٹ کھا کر رہا۔ وہ کہتا تھا میں پیرزادہ ہوں۔ عورتیں تو میرے ہاتھ چومتی ہیں اور آپ ہیں کہ ملنا ہی نہیں چاہتیں۔''

یہاں مجھے شاذیہ اکبر کی شاعری کے بارے میں جناب عطاء الحق قاسمی کے اس جملے کا خیال آتا ہے کہ اردو شاعری میں ایسا بے باک کھرا اور سہل اندازِ بیان خال خال ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔''

شاذیہ نے ایک نظم لکھی ہے ملاحظہ ہو۔ نظم کا عنوان ہے ''کالم نویس''۔

تم/ کالی، بے ڈھنگی، ادھ ننگی/ میلے کپڑوں،
رال ٹپکتی/ آس بھرے خالی پیٹوں کی زندگی کو/ اپنی چمکتی گاڑی کے
شیشے سے تکتے ہو/ اور پھر اپنے دفتر جا کر/ مہنگا
سا سگریٹ سلگا کر/ انگلی پر یوں قلم گھما کر/ بھوک افلاس اور فاقوں پر
اک مضمون بناتے ہو/ میری غربت، بیچ کے
اپنا/ نام اور رزق کماتے ہو

شاذیہ اکبر نظم و غزل کی بہت عمدہ شاعرہ ہیں۔ اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں۔ ان کی ایک اور نظم دیکھیں جس کا عنوان ہے ''حاشیہ''۔

کسی رات کی تیرگی سے نکالا ہوا راستہ ہوں
سیاہ حاشیہ ہوں
سیاہی کہ جو بیکراں کائناتوں کا ملبوس پہنے ستارے جنے گی
سیاہی کہ جس کے سیاہ ریشمی پلوؤں پر کرن اور گوٹے کا بخیہ لگا کر سیا ہے
مہارت سے صبح کا ستارہ کسی نے
سیاہ حاشیہ ہوں جو بچھڑے ہوئے
پانیوں کو جدائی کے ساحل پہ جب روکتا ہے
تو کتنے تھپیڑوں کو سہتا ہے خود پر
تمہیں کیا خبر کیسے گرتی لڑھکتی ہوئی زندگی کو اٹھاتی رہی ہوں
کہاں کس طرح خود سے خود کو بچاتی رہی ہوں
تمہیں کیا خبر کہ میں کیا سوچتی ہوں
مجھے تم نے اک بار جما تھا اور اب مکاں در مکاں میں
ہزاروں برس سے تمہیں بن رہی ہوں
کبھی ایسے لگتا ہے میں حاشیہ ہوں
میرا کوئی مطلب نہ معنی
نہ صورت کی لیلا
کبھی ایسے لگتا ہے جیسے کہ میں اک مسلسل
بہاؤ میں ہوں اور زمانوں کی تحدید بندی پہ مامور ہوں
اک کنارے پہ رہنے کو مجبور ہوں۔

اُردو نظم کے ممتاز شاعر جناب ڈاکٹر وحید احمد شاذیہ کے دوسرے مجموعہ کلام ''محبت حُسنِ کامل ہے'' کے فلیپ پر رقم طراز ہیں:

''ہمارے معاشرے کی عورت پر لازم ہے کہ وہ معاشرتی اور سماجی جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے اور عورت اگر شاعرہ یا دانشور ہو تو یہ فرض اپنی

ادائیگی کے لیے اور بھی سر اُٹھاتا ہے۔ شاذیہ اکبر کی نظمیں گواہی دیتی ہیں کہ وہ یہ فرض ادا کرتی ہے۔ شاذیہ اکبر کی شاعری کومل سُروں کی مدھر کمپوزیشن ہے مگر وہ زندگی کے زخموں میں ہانپتے تیور سُروں کو بھی نہایت سلیقے سے سرگم کے کولاژ میں ٹانکتی ہے۔ اس طرح اس کی شاعری بھیرویں ٹھاٹھ کی اثر انگیز لے کاری ہے جس میں بین السطور ہمارے معاشرے کی تین تال گونجتی ہے۔ بنیادی طور پر اس کے لہجے کا دھیما پن اُس آتش فشاں جیسا ہے جس کی چوٹی سمندر کے شانت پانی سے ڈھکی ہو۔ آگ اور پانی اس کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ ان عناصر کے اُوپر سمندر کی ہوا چلتی ہے جس میں مادرِ وطن کی مٹی سوندھی سوندھی خوشبو دیتی ہے۔''

اگرچہ شاذیہ اکبر کی بہت سی نظمیں اس قابل ہیں کہ انہیں نذرِ قارئین کیا جائے مگر اس کی گنجائش اس مضمون میں نہیں ہے۔ شاذیہ کے مجموعۂ کلام ''محبت حسنِ کامل ہے'' سے دو نظمیں ملاحظہ ہوں:

بڑھاپا

گئے زمانوں کی یادوں کی
بوسیدہ سی شال کو اوڑھے
آج محبت
اپنی سزائیوں کاٹ رہی ہے
جیسے عمر رسیدہ بڑھیا
جاڑے کی سردی میں بیٹھی
بجھتے کوئلے تاپ رہی ہے
سر گھٹنوں کی رحل پہ رکھے اس کا چہرہ
جھریوں کی تحریر میں بیتے لمحوں کے
کتنے فسانے بول رہا ہے
رعشہ زدہ ہاتھوں میں اس کے
ٹیڑھی میڑھی ایک چھڑی ہے
جس سے بڑھیا
اک چنگاری ڈھونڈ رہی ہے
آگ تو کب کی بجھ بھی چکی ہے
اور انگاروں کے جسموں پر
بڑھیا کے بالوں کے جیسی
راکھ جمی ہے

شامِ وصال

کل شام میرے ساتھ محبت کی چاندنی
کچھ اس طرح سے اُتری تھی دل کی زمین پر
جیسے خوش رات کی سانسیں دبی دبی
جیسے ہو اضطراب کسی کی جبین پر
آنکھوں میں رت جگوں کی سلگتی ہوئی جلن
پوروں کی لو میں لرزشیں لمسِ وصال کی
رگ رگ میں سرسراتی سنہری سی چیونٹیاں
ماحول میں تھی خنکی بھی سہمی سی چاپ پر
اک رقصِ آرزو کہ تھا دھڑکن کی تھاپ پر
اک ساحلِ خیال نے قلزم کو گھیر کر
اک وسعتِ خیال کے آنچل میں دے دیا
ہر موج لب کشائی محبت کی کر گئی
یہ کائنات وصل کے عنواں میں ڈھل گئی

اور اب شاذیہ اکبر کی غزلوں سے چند اشعار:

دید سے ذوقِ ملاقات سے آگے نکلے
عشق ممکن ہے تیری ذات سے آگے نکلے

برف سے گرد و سفر اس کا سمندر کی طرف
بوند بھی زعمِ مقامات سے آگے نکلے

ہم چلے آئے تری یاد کا سامان لیے
درد نہ دل کے مضافات سے آگے نکلے

عشق کہتا ہے ابھی اس کا ہنر خام رہے
لوگ کہتے ہیں کمالات سے آگے نکلے

....

اپنا آپ خسارہ کرنا پڑتا ہے
ورنہ عشق دوبارہ کرنا پڑتا ہے

....

تمہیں جتنی میسر ہوں اسی پر اکتفا کر لو
وگرنہ چھوڑ جانے کا گوارا فیصلہ کر لو

....

آنکھیں دیوار ہو گئیں جن کی
اُن کو تصویر بھیج دو اپنی

....

یاد رہتے ہیں کہانی سے نکل جاتے ہیں
آو ترتیب زمانی سے نکل جاتے ہیں

....

کس قدر مہرباں محبت ہے
آج سارا جہاں محبت ہے
سارے ابلاغ کے وسیلوں سے
بے وسیلہ بیاں محبت ہے
آج تنہائیاں رسیلی ہیں
آج میری زباں محبت ہے
جس قدر تم بیان کرتے تھے
اُس قدر اب کہاں محبت ہے

....

اس قدر بے نیام خاموشی
زہر ہے صبح و شام خاموشی
سخت گستاخ منچلی ضدی
بے دھڑک بے لگام خاموشی

چیخ مت کھوکھلی عمارت میں
دھیرے سے کر خرام خاموشی

....

آج چپ چاپ آ کے لیٹ گئی
یاد پہلے تو چھیڑتی تھی مجھے
بعض اوقات سفر ایک ہی کرتے ہیں مگر
ہم سفر صدیوں بنے رہتے ہیں جانے والے

غالب کی زمین میں بھی شاذیہ اکبر نے بہت خوب صورت غزلیں کہی ہیں ۔جن سے ان کی فنی مہارت اور جدتِ خیال کے ساتھ ساتھ نسائی جذبوں کی نزاکت و لطافت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کون ہے جس کو یہاں اب اعتبارِ نغمہ ہے
اُکھڑی سانسیں ہیں سبھی کی اور بارِ نغمہ ہے
ایک دھاگہ باندھ کر میں بھی یقیں کا آ گئی
ایک منت کا دیا بھی غم گسارِ نغمہ ہے
پُچھ رہا ہے آنکھ میں کیا اے مغنی دیکھنا
دھول ہے ماضی کی کوئی یا غبارِ نغمہ ہے
کارواں بھی ہیں میسر ،زادِ راہ بھی ہے مگر
پھر حُدی خوانوں کو کیسا انتظارِ نغمہ ہے
کیا سمندر کے سفر میں بادباں کو دیکھنا
جب ہوا اور بادباں ہی اعتبارِ نغمہ ہے
رابطے کے اس تعطل نے ہماری جان لی
جا بجا ٹوٹا ہوا یہ تار ،تارِ نغمہ ہے
صبح دم سورج نے کھولا کرنوں کا جُوڑا مگر
شب گزیدہ لوگ سمجھے اک شرارِ نغمہ ہے

اور مزید

کس جگہ ہیں کس قدر گر ہیں سمجھ پائیں گے کیا
آپ ان انسوں کے الجھاوے کو سلجھائیں گے کیا
انتہائے وصل سے نا آشنا کا ہے سوال
یہ جو ہیں دوشیزگی کے رنگ اُڑ جائیں گے کیا

شاذیہ اکبر نہ صرف اردو بلکہ پنجابی کی بھی بہت اچھی شاعرہ ہیں ۔ وہ پنجابی کے مرکزی لہجے اور لفظیات کے ساتھ ساتھ اپنے آبائی ضلع اٹک میں بولی جانے والی زبان کے گھیبی و چھاچھی لہجے میں بھی لکھتی ہیں ۔ان کی پنجابی کی نظمیں ،غزلیں اور ماہیے بھی کافی مقبول ہیں گذشتہ دنوں معروف شاعر، کالم نگار، دانشور اور تجزیہ کار محمد اظہار الحق صاحب نے اپنے فیس بک پیج پر ان کی ایک نظم

،،کریں نا بوٹا،، کی تعریف کرتے ہوئے اسے اپنی وال پر شیئر کیا ۔اس نظم کو بھی شامل کیا جاتا ہے ملاحظہ فرمایئے:

کریں نا بوٹا:

میں گاڑاں نے لاہنے پاسے ہک بارانی بوٹا
مینڈی کڑکڑیں لکڑ سہوے نہ سدراں ناں جھوٹا
نہ پتر ،نہ لاگی مینڈی، نہ دُھپاں نہ چھاواں
دُکھیاری جئی جنڈڑی مینڈی ،ماڑیاں ماڑیاں باہواں
نہ کینڈا میں وَست ولیبا ،نہ کوئی جھگی ٹھلی
نہ میں گوندر، نہ میں کانا،نہ ورگا ، نہ بلی
مینڈا ساوا بالن بلّے بنڑ کے سکی پوہلی
میں کی دساں مینڈے اندر کیہڑی گڈھ رسولی
رتّے لال پُھلاں نی چادر ہرسیالے پاواں
نہ پُھلاں میں آپنڑاں سائیں، نہ کوئی ہور بنڑاواں
آپنڑیاں اکھیاں نے پانڑی میں آپے پی پی جیساں
نہ کوئی مینڈا آنڈ گوانڈی، نہ کینڈے نال ریساں

اور چھوٹی بحر کی ایک پنجابی غزل کے چند اشعار دیکھیے:

برفاں وِچ ہُوا اڑاے مولا
پیار وی پُچھی ساڑاے مولا
اکھیاں اُتوں لیندا نا ہیں
ایہہ ڈریاں دا ہاڑاے مولا
وسدا وہیڑہ بھاں بھاں کردا
کس دی پے گئی ساڑاے مولا
اساں نکلے پیر نگا ہنڑیں
اگے پینڈا گاڑاے مولا
اکو تیریاں ہانڈاں سچیاں
باقی کُوڑ کباڑاے مولا

اردو اور پنجابی زبان میں شاعری کے ساتھ ساتھ وہ بہت خوب صورت اور حیران کن اردو نثر بھی لکھتی ہیں ۔ان کی اردو نثر کی جھلک ان کے تجزیاتی و تنقیدی مضامین اور ان کی کتب کے دیباچوں میں دیکھی جا سکتی ہے ۔جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وسیع مطالعہ اور گہرا تنقیدی و تحقیقی شعور بھی رکھتی ہیں ۔ان کا ایم فل اردو کا مقالہ: عصمت چغتائی اور ممتاز شیریں کے افسانوں میں تصورِ عورت پر مبنی تھا ۔اور اا جکل وہ نمل یونیورسٹی اسلام اباد سے پی ایچ ڈی اردو کا مقالہ لکھ رہی ہیں جس کا موضوع نسائی اردو زبان و محاورہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ شاذیہ اکبر پروین شاکر اور فہمیدہ ریاض سے بہتر شاعرہ ہیں ۔ کیونکہ ان کے ہاں شعری اظہار میں فنی رچاؤ کہیں زیادہ ہے اور وہ کہیں بھی شہرت کے لیے فاشی کا سہارا نہیں لیتیں ،جس کی مثالیں پروین شاکر اور فہمیدہ ریاض کے کلام میں موجود ہیں۔

اردو ادب کا عظیم سرمایہ: بابائے اُردو مولوی عبدالحق

سجاد بخاری/ صادق آباد

16 اگست کو ہر سال بابائے اردو مولوی عبدالحق کی برسی منائی جاتی ہے یہ دن پوری دنیا میں اردو بولنے والے اور اردو زبان سے محبت کرنے والے تمام لوگ ان کی یاد میں مناتے ہیں، 16 اگست 1961 کا یہ دن پوری دنیا میں اردو بولنے والوں کے لیے ایک سوگوار دن تھا جب اردو زبان کا ایک عظیم سرمایہ، ایک عظیم معلم، محقق، ماہر لسانیات اور اردو زبان کے عظیم دانشور اور ادیب مولوی عبدالحق کراچی میں انتقال کر گئے اور اپنے کروڑوں چاہنے والوں اور اردو زبان سے محبت کرنے والوں کو سوگوار کر گئے، پوری دنیا ان کی اردو زبان کے لیے عظیم خدمات کی وجہ سے انہیں بابائے اردو کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے، تاریخ میں ان کا شمار اردو زبان سے بے پناہ محبت کرنے والوں اور اردو زبان کے تحفظ اور ترقی کے لیے گراں قدر خدمات انجام دینے والی شخصیات میں ہوتا ہے، آپ 20 اگست 1870 کو ہندوستان میں ضلع میرٹھ کے قصبے ہاپوڑ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم ہاپوڑ میں ہی حاصل کی اس کے بعد آپ نے 1888 میں مزید اعلی تعلیم کے لیے برصغیر کی عظیم درسگاہ علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا، یہ درسگاہ برصغیر کے مسلمانوں کا مرکز قلب ونگاہ تھی اور پورے برصغیر کے گوشے گوشے سے مسلمان یہاں داخلہ لینا اور پڑھنا اپنے لیے اعزاز سمجھتے تھے، اس کالج میں غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے بے شمار انجمنیں قائم تھیں لیکن مولوی عبدالحق نے اپنے لیے ادبی میدان چنا اور علیگڑھ کالج کی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا، یہاں آپ کو علی گڑھ کالج کے سرپرست سرسید احمد خان کی عظیم رفاقت میسر آئی، سرسید احمد خان جیسے جوہری نے اس ہیرے کو پہچان لیا اور انہوں نے آپ کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو جانتے اور پہچانتے ہوئے رسالہ تہذیب الاخلاق کی اہم ذمہ داریاں ان کو سونپ دیں اس طرح سرسید جیسی عظیم شخصیت کی رفاقت اور سرپرستی نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کا علم وادب سے ایسا رشتہ جوڑ دیا جو پوری زندگی ان کی شخصیت کی پہچان رہا ڈاکٹر معراج نیر اپنی تصنیف مولوی عبدالحق کا تصنیفی اور تالیفی سرمایہ میں لکھتے ہیں کہ مولوی عبد الحق کا تصنیف و تالیف کا سلسلہ 1905 میں مولانا ظفر علی خان کی کتاب جنگِ روس و جاپان کے مقدمے سے شروع ہوا اور اس کی اخری کڑی قاموس الکتب کا مقدمہ ہے جو انہوں نے 1961 میں اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل جناح ہسپتال کے کمرے میں مکمل کیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق کی پوری زندگی پرورشِ لوح وقلم میں گزری اور لوح وقلم کی اس طویل رفاقت سے مولوی عبدالحق نے ایسی بے مثال تصنیفی اور تالیفی خدمات انجام دیں کہ اردو ادب کو انمول خزانوں سے بھر دیا، مولوی عبدالحق نے 1894 میں علی گڑھ کالج سے بی اے کرنے کے بعد 1895 میں حیدر آباد دکن کے ایک سکول میں بطور معلم ملازمت شروع کی پھر ترقی کرتے کرتے اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات بنے اور پھر اورنگ آباد کالج کے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے، آپ نے 1902 میں اردو زبان کے فروغ کے لیے ایک عظیم قدم اٹھایا اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر انجمن ترقی اردو کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کا مقصد اردو زبان کا فروغ اور تحفظ تھا، جب آپ اورنگ آباد کے پرنسپل بنے تو انجمن ترقی اردو کا دفتر اورنگ آباد منتقل کر دیا، آپ نے انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم سے اردو زبان کے فروغ کے لیے بے پناہ علمی اور ادبی خدمات انجام دیں انجمن کے پلیٹ فارم سے اردو کے کئی نادر نسخے چھاپے، اردو زبان میں کئی سہ ماہی رسائل شائع کیے، دارالترجمہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جہاں مختلف زبانوں میں لکھی گئی اہم کتب کے تراجم کیے گئے اور پھر قیام پاکستان کے بعد انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم سے اردو سائنس کالج، اردو آرٹس کالج، اردو کامرس کالج اور اردو لاء کالج جیسے ادارے قائم کیے، اس کے علاوہ آپ نے انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم سے لسانیات، لغت اور جدید علوم پر دو سو سے زیادہ کتب شائع کیں اور ایک لاکھ سے زائد علمی اور سائنسی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کیا، اس طرح کے اقدامات سے نہ صرف اردو زبان کو فروغ حاصل ہوا بلکہ نوزائیدہ مملکت پاکستان کی علمی بنیاد مضبوط ہوئی، اس کے علاوہ آپ کی تصنیف وتالیف کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے آپ کی بے پناہ تصانیف کی وجہ سے اردو زبان وادب کو جو فروغ حاصل ہوا اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی، یہ حقیقت بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مختلف کتب کی تصنیف کے علاوہ آپ نے خاکہ نگاری میں بھی بہت بلند مقام حاصل کیا، ان کی خاکہ نگاری کے اعلی نمونے چند ہم عصر میں نظر آتے ہیں یہ ان کی طویل اور مختصر خاکوں کی ایسی کتاب ہے جس میں انہوں نے علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، مولانا حالی اور سرسید سمیت اپنے بہت سے ہم عصروں کے بہت دلچسپ خاکے لکھے ہیں، انہوں نے

چند ہم عصر میں اپنے رفیقوں کی شخصیت کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والوں کے لیے ان شخصیات کے اعلی کردار کو بہت واضح کر دیا ہے، اسی لیے پڑھنے والوں کو ان کے خاکوں میں بہترین کردار نگاری کے نمونے بھی ملتے ہیں، وہ ایک اعلی پائے کے تاریخ داں بھی تھے اور مترجم بھی تھے انہوں نے بے شمار کتابوں کے اردو میں ترجمے بھی کیے اور تاریخ کے موضوع پر بھی بہت سی کتابیں لکھیں، مقدمات عبدالحق، اردو کی نشو نما میں صوفیا کا کردار، سر آغا خان کی اردو نوازی، مرحوم دہلی کالج، سر سید حالات و افکار، افکارِ حالی، انتخاب کلام میر ان کی شہرہ آفاق تصانیف ہیں، مولوی عبدالحق کا سب سے بڑا خواب تھا کہ وہ ایک اعلی معیار کی اردو یونیورسٹی قائم کریں 1940 میں انہوں نے آل انڈیا ترقی اردو کانفرنس (ناگپور) میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی قرارداد منظور کروائی اور پھر کانفرنس کے بعد قائد اعظم کو کھانے پر بلایا اور ان کے سامنے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز رکھی قائد اعظم نے اس تجویز کو بہت سراہا اور اس میں بہت دلچسپی ظاہر کی، جب پاکستان بن گیا تو مولوی عبدالحق اس امید کے ساتھ پاکستان چلے آئے کہ اب ان کا خواب پورا ہونے کا وقت آگیا ہے، لیکن بدقسمتی سے ایک سال کے اندر قائد اعظم کا انتقال ہو گیا، لیکن انہوں نے اپنے خواب کی تکمیل کے لیے پہلا قدم اٹھایا اور انجمن ترقی اردو کے زیر انتظام گلشن اقبال کراچی میں اردو سائنس کالج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اس ادارے نے 1949 میں باقاعدہ کام شروع کر دیا، صدر مشرف کی حکومت کے دوران ڈاکٹر عطاء الرحمان نے مولوی عبدالحق کے قائم کردہ سابقہ وفاقی اردو کالج برائے سائنس (گلشن اقبال) اور سابقہ وفاقی اردو کالج برائے فنون و تجارت (مولوی عبدالحق کیمپس) کو ترقی دے کر وفاقی اردو یونیورسٹی کا درجہ دینے کا اعلان کر دیا اور 13 نومبر 2002 کو صدر مشرف نے باقاعدہ طور پر وفاقی اردو یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھ کر بابائے اردو مولوی عبدالحق کا خواب پورا کر دیا، اس وقت وفاقی اردو یونیورسٹی کے تین کیمپس ہیں عبدالحق کیمپس کراچی، گلشن اقبال کیمپس کراچی اور اسلام آباد کیمپس فروغ علم کے لیے اپنا بھر پور کردار ادا کر رہے ہیں، غرض بابائے اردو مولوی عبد الحق بیسویں صدی کی ایک ایسی نابغہ روزگار شخصیت تھے جنہوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اگر بابائے اردو نہ ہوتے تو برصغیر میں اردو زبان کا تحفظ اور فروغ ممکن نہ ہوتا اور اردو زبان کے لیے ترقی کی اتنی منزلیں طے کرنا آسان نہ ہوتا، اردو زبان کو وسعت اور عظمت آپ کے کردار سے ہی ملی، انہیں کی کوششوں سے اردو زبان تحریک پاکستان کا ہراول دستہ بنی اور تحریک پاکستان کے تمام قائدین نے اپنی تقریروں میں اردو زبان کو ہی اپنا ذریعہ اظہار بنایا، اور پھر آخر کار قیام پاکستان کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح نے اردو زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کا اعلان کیا، قوم بابائے اردو کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھے گی، آپ کی ان عظیم خدمات کے اعتراف میں 23 مارچ 1959 کو حکومت پاکستان نے آپ کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی سے نوازا، سراپا اردو اور مجسم اردو مولوی عبد الحق 16 اگست 1961 کو خالق حقیقی سے جا ملے اور اپنے چاہنے والوں کو ہمیشہ کے لیے سوگوار کر گئے، آپ کو وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی کے احاطہ میں دفن کیا گیا اردو زبان و ادب کا یہ عظیم سپوت وہیں آسودہ خاک ہے

درزی اور گھڑا

نمرہ فاروق - لاہور

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پرانے دنوں میں ری شہر میں ایک درزی تھا اسکی دوکان قبرستان کے راستے میں تھی۔ جب ایک مردہ شخص کو قبرستان لے جایا جاتا تو وہ درزی کی دکان کے سامنے سے گزرتے تھے۔

ایک روز درزی نے سوچا کہ ہر مہینے شہر کے مرنے والوں کی گنتی کرے، لیکن چونکہ اس نے پڑھنا لکھنا اور حساب کتاب نہیں کیا تھا اس نے ایک کیل کو دیوار میں ٹھوکا اور ایک کوزہ اس کے اوپر لٹکا دیا اور ایک مٹھی ریت اس کے اندر ڈال دی۔ جب جنازہ اسکی دوکان کے سامنے سے لے جایا جاتا تو وہ ایک پتھر اس کوزہ میں پھینک دیتا۔ آخر میں وہ برتن کو خالی کرتا اور شمار کرتا کہ اس مہینے میں کتنے لوگ مرے ہیں۔

آہستہ آہستہ ہمسایے بھی درزی کو سمجھ گئے۔ یہ موضوع ان کے لیے مشغلہ تھا۔ کبھی کبھی جب وہ اس سے بات کرتے تو اس سے پوچھتے: "اچھا صورتحال کیا ہے؟" درزی کہتا: "آج دو افراد کوزے میں گئے۔"

کچھ دن بعد اتفاقاً درزی بیمار ہو گیا اور اس دنیا سے چلا گیا اور اس کی دوکان بند ہو گئی۔ چند دن بعد ایک شخص کو اس درزی سے کام پڑا اسکو درزی کی موت کی خبر نہیں تھی وہ دوکان پر پہنچا اور دوکان بند پائی۔ کسی ہمسائے سے پوچھا: درزی کہاں ہے؟

ہمسائے نے کہا: "درزی بھی کوزہ میں گیا۔"

اُس روز یہ ضرب المثال بن گئی جب ایک شخص مصیبت میں گرفتار ہوتا تو اُس کے بارے میں بات کی جاتی ہے، میں نے کہا: "درزی کوزہ میں گیا۔"

ممتحن (External) مقرر کیا۔ وہ اُن دنوں ۲۶۹۔این سمن آباد میں رہتے تھے اور دن رات کام کرتے تھے۔ بھاری بھرکم جثّے کے باوجود میں نے اُن جیسا اَن تھک آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ اُن دنوں اُن کا معمول یہ تھا کہ وہ ہفتہ بھر دفتری اوقات میں ''بزمِ اقبال'' کے ناظم الامور کی حیثیت سے ۲۔کلب روڈ پر ''مجلسِ ترقی ادب'' کی عمارت میں بیٹھتے تھے اور پھر سرِشام سے لے کر رات گئے تک اپنے گھر سے نزدیک ہی ''مغربی پاکستان اردو اکیڈمی'' میں بیٹھتے تھے۔ اردو کی ترویج و اشاعت کے جتن اور اردو کی کتابیں شائع کرنا اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

میں نے باقر صاحب کی خدمت میں گزارش کی کہ ہمیں ڈاکٹر وحید قریشی کو ضرور ملنا چاہیے مبادا وہ کام کاج کی کثرت یا کسی اور مصروفیت کی بنا پر ممتحن ہونے سے انکار کر دیں۔ باقر صاحب بھی ان سے ملنا چاہتے تھے۔ شاید اس کی وجہ وہ خفت مٹانا بھی تھی، جسے وہ اپنے دل میں لیے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم ڈاکٹر وحید قریشی کو ملنے کے لیے کشاں کشاں ''بزمِ اقبال'' پہنچے۔ وہ اپنے دفتر میں موجود تھے۔ میں نے اس سے پہلے ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں سُنا تو بہت تھا اور ان کی تہلکہ خیز تصنیف ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' اور تالیف ''مقدمہ شعر و شاعری'' میری نظروں سے گزر چکی تھیں، جنھوں نے میرے دل و دماغ میں اس طرح کا تاثر چھوڑا تھا کہ یہ شخص بہت باریک بیں ہے اور دور کی کوڑی لاتا ہے مگر مجھے اس سے قبل ڈاکٹر صاحب سے دوبدو ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا تھا۔

ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں پہنچے تو انھوں نے بڑے تپاک اور خندہ پیشانی سے باقر صاحب کا استقبال کیا اور گرم جوشی سے ہم دونوں کے ساتھ بیٹھے بیٹھے مصافحہ کیا۔ دراصل ڈاکٹر وحید قریشی ڈیل ڈول کے اعتبار سے غیر معمولی انسان تھے۔ گیم و شحیم اتنے کہ میں نے آج تک بچشم ان سے زیادہ فربہ شخص نہیں دیکھا۔ نہ اس سے پہلے دیکھا تھا نہ آج تک دیکھا ہے۔ کم از کم لاہور جیسے بڑے شہر میں تو فربہی کے اعتبار سے وہ اپنی مثال آپ تھے۔ اس دن وہ کلف لگے سفید کرتے شلوار میں ملبوس بڑے نستعلیق لگ رہے تھے۔ میں نے بعد میں بھی انھیں اکثر و بیشتر اسی لباس میں دیکھا۔ ہاں البتہ سردیوں میں کرتے شلوار پر صدری اور سر پر گرم گول پشاوری ٹوپی کا اضافہ ہو جاتا۔ شاید اس لباس کو وہ اپنی جسامت کے اعتبار سے زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ میں نے سردیوں کے موسم میں انھیں ایک آدھ مرتبہ گرم سوٹ میں بھی ملبوس دیکھا، جس میں وہ اور بھی بارعب لگتے تھے۔ لہجے میں طنطنہ تھا اور وثوق کے ساتھ اس طرح گفت گو کرتے تھے کہ نحوی اعتبار سے ایک ایک لفظ بخوبی علیحدہ ہو سکتا تھا۔ مجھے اُن کی اُس دن کی گفت گو آج بھی اس طرح یاد ہے جیسے یہ کل کی باتیں ہیں۔ باقر صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

''باقر صاحب یہ جو دمے کے مریض ہوتے ہیں، بڑی لمبی عمر پاتے ہیں۔ نہ میں جلدی مرنے والا ہوں، نہ آپ جلدی مرنے والے ہیں۔ میں نے آپ کے علامہ اقبال پر پانچ چھے مضمون پڑھے ہیں۔ آپ یوں کریں کہ علامہ اقبال پر دو تین مضمون اور لکھ دیں اور کتاب بنا کر مجھے دے دیں۔ میرے پاس کہیں سے کچھ پیسے آ گئے ہیں، میں جلدی چھاپ دوں گا۔''

اس کے بعد انھوں نے متجسس نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو باقر صاحب نے میرا مختصر سا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''ان کا نام علی محمد خاں ہیں۔ پانی پت کے ہیں۔ آج کل وحدت روڈ سائنس کالج میں اردو پڑھاتے ہیں۔ انھوں نے میری نگرانی میں ''لاہور کا دبستانِ شاعری'' کے عنوان سے پی ایچ۔ڈی کا مقالہ مکمل کیا ہے اور......''

باقر صاحب اپنی بات مکمل نہ کر پائے تھے کہ ڈاکٹر صاحب میری جانب رخ کر کے کہنے لگے:

''اچھا تو آپ مولانا حالی کے گرائیں ہیں۔ آپ کا مقالہ میں نے جستہ جستہ دیکھ لیا ہے۔ بہت اچھا موضوع ہے اور محنت سے لکھا ہے۔ میں ایک دو دنوں میں رپورٹ یونیورسٹی کو بھیج دوں گا۔''

ڈاکٹر وحید قریشی کے منھ سے اپنے کانوں یہ جملے سنے تو میری جان میں جان آئی اور وہ اَن دیکھی سی دھند جو بہت دنوں سے میرے چاروں طرف چھائی ہوئی تھی، جیسے زمین پر سورج کی ابتدائی کرنیں پڑتے ہی چھٹ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے باقر صاحب کی میرے بارے میں پیش گوئی سچ ثابت ہونے کا وقت قریب ہے۔ میری آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگی مگر میں نے اسے باہر نہیں نکلنے دیا۔ اتنے میں قہوہ آ گیا اور ہم سب قہوہ پینے لگے۔ گرمی ہوتی یا سردی ڈاکٹر وحید قریشی کے آفس میں قہوہ چلتا تھا۔ انھیں قہوہ خود بھی بہت پسند تھا اور آنے والوں کی تواضع بھی وہ قہوے ہی سے کرتے تھے۔ اس دن اُن کے صوفے کے بالکل سامنے ایک منحنی سے مگر مدبر و شائستہ شخص خاموش بیٹھے تھے، میں نے موقع غنیمت جانا اور جگہ دیکھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا اور جب ڈاکٹر

جواز جعفری کی نظم کا تجزیہ

سلیم نگار

میرے لیے یہ بات اعزاز سے کم نہیں ہے کہ ڈاکٹر جواز جعفری صاحب نے اپنی اس خوبصورت نظم آئینے سے مکالمہ کرتی عورت کے تجزیے کے لیے مجھے منتخب کیا اپنے سینئر کا کہا میرے لیے اعزاز تو ہے ہی مگر آپ کی نظم پر کچھ کہنا میرے لیے پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے کہ ڈاکٹر جواز جعفری میرے ان پسندیدہ شعرا میں شامل ہیں جن کی نظمیں/غزلیں اور ان میں بہتی ہوئی علامتی و استعارتی فضا میرے لیے ہمیشہ خوشگوار اور زرخیز حیرت کو اور پراسرار کرتی ہے نظم میں عام اور روزمرہ کے الفاظ کو جدید تر علامت اور استعارہ کے طور پر برتنے کے ہنر کی جب بھی بات ہوگی ڈاکٹر جواز جعفری صاحب کا ذکر سرفہرست ہوگا

ڈاکٹر صاحب کی نظم کی پرتیں کھولنے کے لیے قاری کا انسان کی معاشرتی جغرافیائی اور تہذیبی تاریخ پر گہری نظر ہونا بہت ضروری ہے وگرنہ نظم اس کے لیے محض الفاظ اور سطور کی ترتیب اور ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں ہوگی۔

مرد اور عورت کی آفرینش کے ساتھ ہی ان کے اندر قدرت نے ایک دوسرے کی کشش کا جذبہ بھی ودیعت کر دیا تھا جس کے زیر اثر انسانی تاریخ کی پہلی بغاوت ظہور پذیر ہوئی جس نے اس کائنات کے نئے خدوخال ترتیب دیے،

یوں تو ہر عہد میں عورت کی بے اعتنائی اور اس کا گلہ عمومی و مساوی طور پر ہوتا رہا ہے مگر ہر عہد کے تخلیق کار نے اس کا اظہار اپنے مخصوص انداز و اسلوب میں کیا ہے زیر نظر نظم میں بھی شاعر نے اپنے محبوب کی بے اعتنائی کے ردعمل میں اپنے اندر کرب اور دکھ کے دہکتے ہوئے الاؤ کا ذکر کیا ہے کہ محبوب ہمہ تن اپنی ذات اور حسن کی نرگسیت کے حصار میں قید ہے اور عشق کی حدت آنچ سے ابھی آشنا نہیں ہے جو مسلسل اس کی ذات اور محبت کو نظر کیے ہوئے ہے اسی لیے وہ کہتا ہے کہ محبت کی جوگ میرے اندر بھڑک رہی اگر اس آگ کا غسل میرا محبوب بھی کرتا تو عشق کی اس آگ کی سرخی اس کے حسن کو اور بڑھا دیتی اور اس کے مزاج اور فطرت کو بالکل بدل دیتی۔

نظم کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی عمدگی سے میں کو ہم میں بدل کر اپنے عہد کو انسانی تاریخ سے جوڑ کر اس رشتے کو ازل و ابد تک پھیلا دیا ہے وہ کہتے ہیں گویا کرہ ارض میں شرق و غرب جنوب و شمال کے ہر کونے میں ہزاروں سال پہلے سے لے کر اب تک جو دل جذبہ؟ عشق سے منور و لبریز تھا اور ہے وہ میرا دل ہے اور وہ میں ہی تھا یہ بات کر کے انھوں نے اپنی ذات اور اس جذبے کو گویا ایک ا؟ فاقیت و ہمشگی عطا کر دی ہے اور اس رُو میں خود کو بھی امر کرتے ہوئے اپنی گہری محبت کا یقین کئی زاویوں سے کرایا ہے۔

اے دارچینی کے رنگ سے
بنی عورت!
تیرا مزاج لیموں کے رس سے
تخلیق ہوا ہے کیا

ڈاکٹر جواز جعفری عام لفظوں کو بھی اپنی مخصوص استعارتی صنعت گری کے ہنر سے گزار کر یوں برتتے ہیں کہ قاری دم بخود رہ جاتا ہے

لہجے کی ترشی کو کئی شاعر بیان کرتے ہیں مگر یہ اظہار کسی کو نصیب نہیں کہ وہ محبوب کی زبان کی ترشی کو لیموں کی کھٹاس سے ہم آہنگ کرے کہ لیموں اپنے ذائقے کی شدت کے باوجود زبان کو ایک مختلف ذائقے سے بھی روشناس کراتا ہے اور زبان اس ذائقے کی خواہش بار بار کرتی ہے اور دل اس کی بے اعتنائی کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ اس کے حسن نے اسے اپنے علاوہ میری خواہش سے بہت اونچا کر دیا ہے مگر ایک محبوب کا نازک اور حساس دل پھر بھی ہارتا نہیں اور کہتا ہے کہ اگر وہ بادشاہ ہوتا تو اپنے نام کے سکے پر اس کا نام بھی کندہ کرتا یہ اظہار اور جذبہ محبت میں یکجا؟؟ ی اور برابری کی فضا کو ترتیب دیتا ہے اور یہ سچ بھی کہ جس تعلق اور جذبے میں برابری نہ ہو اس میں احترام کے فقدان سے اس تعلق کی بنیادیں ہمیشہ کمزور رہتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد طاہر بوستان خان/سوات

میں اپنے چند ایسے ہم عصروں کا ذکر کروں گا جن کے بارے میں قطعی طور پر مبالغہ آرائی سے کام نہیں لوں گا۔ آپ یوں سمجھیے میں ان کا خاکا کھینچ رہا ہوں۔ نیز اس تحریر سے کسی کی بھی ہر قسم کی دل آزاری مقصود ہے۔ اور وہ اس لیے کہ میں جن حقائق سے پردہ اٹھاتا ہوں وہ حقیقت پر مبنی ہیں، جن کا میں بذاتِ خود چشم دید گواہ ہوں، مجھے کسی اور گواہ کی ضرورت بالکل نہیں۔

میرے ہم عصروں میں زیادہ تر ادیب اور شاعر لوگ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شعرا قوم کی آنکھیں ہوتی ہیں مگر میری اکیلے کی دعا ہے کہ بعض ان میں ایسے بھی ہیں کہ ان جیسی آنکھوں کی ''نورِ بصیرت'' سے اللہ تعالیٰ اس قوم کی ہمیشہ کے لیے حفاظت فرمائے (آمین)۔

ویسے تو ہر ہنر کا ماہر خود کو اس میں یکتا سمجھتا ہے لیکن شعرا کے نزدیک یہ ''وبا'' دوسرے ہنر مندوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ پائی جاتی ہے۔ مثلاً ایک شاعر ہیں جو کہتے ہیں کہ یہاں کے تمام شعرا میرے جیسا شعر کبھی بھی نہیں لکھ سکتے، اپنے ایوارڈز پر انہیں بڑا ناز ہے۔ مشاعروں میں عام طور پر بچگانہ حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ آپ یقین جانیے کہ لوگ انہیں ان کی حرکتوں کی وجہ سے Ignore کر کے انہیں ''بے وقوفوں کے چیئر مین'' کہتے ہیں۔ اور وہ صاحب ہیں کہ لوگوں کی طرف سے ملنے والے اس نام کو بھی اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ بازار میں اگر ان سے ملاقات ہو جائے تو دوسرے شعرا کی غیبت کے ساتھ کھڑے کھڑے تین چار غزلیں سنا کر پھر بھی سیر نہیں ہوتے۔

ایک دوسرے ہم عصر ہیں۔ وہ اٹھاؤ چولہا ہیں۔ شیطان نے انہیں اپنی خاص ڈیوٹی ''لوگوں کو آپس میں لڑانے'' پر مامور کیا ہوا ہے۔ خوشامد ان کی کمزوری ہے۔ دعوت کے لیے دوزخ میں بھی جانے کو تیار رہتے ہیں۔ منہ سے کم اور ہاتھوں سے زیادہ بولتے ہیں۔ خود کو دانشور سمجھتے ہیں حالاں کہ ہیں نہیں، عام طور پر ہر شاعر کے ہر شعر پر خوشامدی کے لیے واہ واہ کہتے نظر آتے ہیں۔ ستم ظریفی تو یہ کہ بعد میں ان شعرا کے پیٹھ پیچھے بولتے ہیں۔ شعرا کے خلاف بولتے ہوئے نہ صرف ان کی شاعری کو بل کہ براہِ راست ان کی ذات کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتے۔ یہ صاحب انتہائی موقع پرست واقع ہوئے ہیں۔ غیبت کے بغیر انہیں کھانا ہضم نہیں ہوتا، بے جا تنقید کرتے ہیں۔ عورت ذات ان کی بڑی کمزوری ہے۔ ادبی محافل میں شرکت محض تنقید کے لیے کرتے ہیں۔

ایک اور صاحب ہیں جو لکھتے تو ہیں لیکن بہت کم۔ دوسروں کے اشعار پر اپنا لیبل چسپاں کر کے پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک ان کا کوئی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا۔ مشاعروں میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے ہیں، بزرگ اور نامی گرامی شعرا کی چاپلوسی کرنا شاید انہیں وراثت میں ملا ہے۔ انسانوں کے مابین شیطان کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے وضع قطع، لباس اور گفتار سے ویسے تو وہ فرشتہ نظر آتے ہیں لیکن اندر سے کھوکھلے ہیں۔ حلیہ سے ٹرک کے کنڈیکٹر نظر آتے ہیں۔ دیگر شعرا سے تعلقات بنانے کی ناکام کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ پشاور کے بہت سارے شعرا نے تو انہیں باقاعدہ طور پر مشاعروں میں شرکت کرنے سے منع کیا ہوا ہے۔ مقامی سیاست دانوں کی چمچہ گیری کرتے کرتے ان میں مقبول نہ ہونے کے غم سے ڈپریشن کا شکار ہو کر گولیاں لینے کے عادی بن چکے ہیں۔ انہیں کبھی نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ دوسروں کو بلیک میل کرنے کے طریقے کوئی ان سے سیکھے۔ شعرا کے پیچھے باتیں کرنا اور انہیں شاعر تسلیم نہ کرنا ان کا مفید مشغلہ ہے۔

ایک اور صاحب ہیں جن کا شعری مجموعہ (کچھ اپنے اشعار کچھ دوسروں کے نذر کیے ہوئے) کا چھپ چکا ہے۔ یہ صاحب تو شکل سے ہی چور معلوم ہوتے ہیں۔ انسانیت نام کی چیز ان میں نہیں۔ مشاعروں میں صرف کھانے کے لیے شرکت کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ لوگ انہیں مشاعروں میں نہیں بلاتے۔ دغابازی، چالبازی اور فراڈ کے لیے پورے خطے میں مشہور ہیں۔ ان کی کہانیاں زبان زدِ عام ہیں اس لیے اب انہیں کوئی برا ہی نہیں سمجھتا۔ وہ گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتے بل کہ الٹا اس پر فخر کرتے ہیں۔ باتوں پہ آ جائے تو کسی وکیل سے کم نہیں دِکھتے۔ وہ لاکھ چاہے خاندانی اور سوشل بننے کی کوشش کریں لیکن بے سود۔ ان کی شاعری بھی ایسی ہے جسے سُن کر اُلٹیاں کرنے کو جی چاہے۔ ان کی ناکام شاعری کی یہی دلیل ہے کہ کافی عرصہ گزرا نہ تو ان کا کوئی تازہ کلام سامنے آیا اور نہ ہی کوئی تحریر۔

میرے ہم عصروں میں ایک اور صاحب ہیں جو

پشتو میں شاعری کرتے تو ہیں لیکن خود پشتو شاعری میں ہار تسلیم کر چکے ہیں۔ستم ظریفی یہ کہ پھر بھی بے وزن شعر کہتے ہیں۔شعرا کے حلقوں میں خود کو زندہ رکھنے کے لیے کبھی کبھار مشاعروں میں اسٹیج بھی چلاتے ہیں۔ان کی شاعری کو کافی شعرا دوسر سمجھتے ہیں۔وہ ہمیشہ بے وزن شعر کہتے ہیں۔خواتین کے معاملے میں وہ خود بھی بے وزن ہو چکے ہیں۔سیلفیاں لینا اور فیس بک پر شیئر کرنا ان کی عادت بن چکی ہے۔سماج میں وہ خود کو عزت دار سمجھتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔کئی موقعوں پر خواتین کے شوہروں اور بھائیوں سے اعلیٰ قسم کی گالیوں کے تحائف کے ساتھ ساتھ مار بھی کھا چکے ہیں لیکن باز نہیں آتے۔ان صاحب میں ایک بات یہ ہے کہ لباس اچھا زیب تن کرتے ہیں، گفتگو بھی اچھی کرتے ہیں اس لیے ان پر شک نہیں گزرتا۔ بڑے حاسد ہیں، اپنے سے سینئر شعرا کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ظاہر ہے جب انسان کے ساتھ اپنی عزت نہ ہو وہ دوسروں کی عزت کا خاک خیال رکھے گا۔ ہاں جن سے توقع رکھتے ہیں ان کی خوشامد ضرور کرتے ہیں۔غیبت بالکل نہیں کرتے۔

ایک اور صاحب ہیں جن کے اب کوئی دو تین مجموعے طباعت کے زیور سے آراستہ ہو چکے ہیں۔وہ خود کو اپنے علاقے کا بہت بڑا شاعر سمجھتے ہیں حالاں کہ ہیں نہیں۔اُردو میں بھی ایک آدھ بار مشق کر چکے ہیں لیکن بری طرح ناکام رہ کر پشتو میں ہی لکھتے رہتے ہیں۔تقریباً ہر محفل کی زینت بنتے ہیں۔نامور شعرا کی چاپلوسی انہیں وراثت میں ملی ہے۔خود کو پشتو زبان و ادب کے نقاد بھی سمجھتے ہیں لیکن یہ الگ بات ہے کہ وہ اصول تنقید سے بالکل بے خبر ہیں۔شعرا کی غیبت کرنے سے انہیں دلی آرام وسکون ملتا ہے۔ان کے قول وفعل میں نمایاں تضاد ہوتا ہے۔ سیر ہو کر کھانا انہیں کبھی نصیب نہیں ہوا، اس لیے تو یار دوستوں کے دستر خوان پر بیٹھ کر تصویر شیئر کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔

ایک اور نثر نما شاعر ہیں جو نجانے خود کو کیا سمجھتے ہیں ہر وقت خود نمائی میں مصروف ہوتے ہیں۔چوں کہ کافی شعرا کے نزدیک ادب میں ان کا کوئی خاص مقام نہیں اس لیے جنھوں نے قریب سے پہچانا ،وہ ان سے دامن بچا کر رہتے ہیں۔شعرا کی کتابوں کے مفت حصول کے لیے گردن توڑ کوشش کرتے ہیں۔ کتاب کے حصول کے بعد پڑھ کر اس میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں اس لیے اب زیادہ تر شعرا انہیں اپنی کتاب مفت نہیں دیتے اور قیمتاً لینے سے تو وہ عاجز ہیں اس لیے اس کی کمینگی میں کافی حد تک کمی آگئی ہے۔

ایک اور صاحب ہیں جو ادب کے لیے انتہائی خطرناک واقع ہوئے ہیں۔یہ صاحب نہ تو شاعر ہیں نہ نثر نگار اور نہ ہی ادب کے لیے کوئی خاص خدمات انجام دیں۔ لکھتے ہوئے اغلاط کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔نتیجتاً لوگوں کے تمسخر کا نشانہ بنے پھرتے ہیں۔اُردو پشتو کی طرح بولتے ہیں۔انہوں نے شعر کو نثر میں کہنے کا ایک نیا انداز بیان ایجاد کیا ہوا ہے۔غرور اتنا کہ اللہ توبہ۔

اس کے علاوہ میرے ہم عصروں میں اچھے لوگ بھی ہیں جن میں ایک عمر رسیدہ صاحب ہیں۔ انتہائی سلیقہ مند ہیں۔مہمان نواز ہیں۔اب تک ان کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔عمر کا زیادہ تر حصہ دیار غیر میں گزار چکے ہیں۔تقریباً ہر مشاعرے کی زینت بنتے ہیں، نہ صرف زینت بنتے ہیں بل کہ اس تقریب پر روداد لکھ کر تصاویر کے ساتھ ساتھ شیئر کرتے ہیں۔ بزرگ ہیں لیکن طبیعت میں لڑکپن اب بھی موجود ہے۔راقم کو تمام شعرا میں ان کے ساتھ دل لگی ہے۔گپ شپ میں انہیں چھیڑتے بھی خوب ہیں لیکن ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار کبھی نہیں دیکھے۔آپ فیس بک کی تبلیغ میں یکتا ہیں۔اللہ کا شکر ہے کہ گھریلو مشکلات سے دُور ہیں اس لیے ادب کی خوب خدمت کرتے ہیں۔

ایک اور صاحب ہیں جس کی زندگی کا مقصد انقلاب ہی انقلاب ہے۔ یہ صاحب انتہائی مہمان نواز ہیں۔شعرا سے قدرے خفہ ہیں لیکن پھر بھی شاعری کرتے ہیں۔انسانیت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔عوامی نیشنل پارٹی کے سرگرم رکن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے حلقے کے ناظم بھی رہ چکے ہیں۔غمی وخوشی کے موقعوں پر پیش پیش ہوتے ہیں۔کمال کی شاعری کرتے ہیں۔اچھی عادتوں اور خصلتوں کے مالک ہیں، کسی سے ڈرتے نہیں، جو دل میں آیا وہ زبان سے کہہ دیا یہی وجہ ہے کہ کافی لوگ ان سے بد ظن ہیں۔

اسی طرح میرے ہم عصروں میں کئی طرح کے لوگ ہیں جن کے بارے میں لکھتے ہوئے وقت ساتھ نہیں دیتا ورنہ ایسی ہستیوں کے ساتھ قارئین کی ملاقات کرواد یتا کہ قارئین دنگ رہ جاتے۔اللہ ہماری حالت پر رحم فرما، ہمیں نیک مسلمان بنا، ہمیں دوسروں کی غیبت کرنے سے بچا، ہمیں صحیح معنوں میں دین اسلام اور ادب کی خدمت کے قابل بنا۔(آمین)

حسن عباسی کی جدید طویل نظم ''محبت سے کون ڈرتا ہے'' ایک تجربہ

ساحل سلہری/ سیالکوٹ

نظم معرا سے نثری نظم تک کا سفر کچھ روایتی پابندیوں سے ماورا ہے۔ نثری نظم اعلا تخلیقی تجربہ ہے جو دیگر شعری تجربوں سے مختلف نوعیت کا ہے۔ مبارک احمد، عبدالرشید، ذی شان ساحل، افضال احمد سید اور دیگر اولین جہد کنندگان سمیت FullTime نثری نظم نگار ڈاکٹر جواز جعفری کے شعری مجموعوں میں کوئی بھی طویل نظم نظر نہیں آتی اور نہ ہی ان کا کوئی شعری مجموعہ کسی ایک طویل نظم پر مشتمل ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان شعرا نے نثری نظم کو معتبر اور مستحکم ہیئت کا درجہ دلایا ہے۔ لیکن حسن عباسی کی صورت میں نثری نظم کو وہ شاعر میسر آ گیا ہے جس نے پہلی بار طویل ہیئت میں نثری نظم کی شعریات کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ ابتدائی دور سے اب تک متعدد شعرا نے اپنی اپنی بساط کے مطابق نثری نظم کو فروغ دیا ہے لیکن حسن عباسی نے انتہائی انہماک کے ساتھ اس صنف کو شعری اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ حسن عباسی کی طویل نثری نظم ''محبت سے کون ڈرتا ہے'' کے اضافے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب نثری نظم میں تجربے کی گنجائش کم ہے۔ حسن عباسی تخلیقی انہماک رکھنے والے اصیل شاعر ہیں۔ ان کی طویل نثری نظم کی مثال اردو شاعری کی روایت میں نظر نہیں آتی۔ یہ اختصاص انھیں غیر روایتی شاعر کے طور پر سامنے لاتا ہے۔ ان کی طویل نظم جدید اردو (نثری) نظم کی روایت میں ایک لاثانی روایت کا آغاز ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ نظم کی تخلیق میں ہمہ وقت مصروف رہے ہیں۔ ان کی نظم پرت در پرت پھیلے ہوئے متن، منفرد لفظی و معنوی کیفیات، انفرادی و اجتماعی جذبات و احساسات کی عکاسی کرتی ہے۔ حسن عباسی نے غزل اور سفر نامہ نگاری کے بعد نظم نگاری کا آغاز بڑا توانا انداز میں کیا ہے۔ ان کی پہلی جدید طویل نثری نظم ''محبت سے کون ڈرتا ہے'' اپنی نوعیت کی واحد نظم ہے۔ یہ نظم ایک مرکزی نسائی کردار کے سہارے ماضی، حال اور فطرت کے کئی مناظر لیے آگے بڑھتی ہے۔ پوری نظم میں ''تم'' کو مخاطب کیا گیا ہے اور تم کبھی عورت، کبھی مرد، کبھی زمانہ اور کبھی فطرت کے پیکر میں نظر آتا ہے۔ حسن عباسی نے اس طویل نظم کو ایک نسائی پیکر سے مسلسل مکالمہ بازی کرتے ہوئے آگے بڑھایا ہے۔ انھوں نے یہ مکالمے دن اور رات کے مختلف اوقات میں کیے ہیں۔ اس نظم میں کوئی بند نہیں بل کہ سطر در سطر مختلف موضوعات ملتے ہیں۔ ایک سطر میں ایک بات اور دوسری سطر میں کوئی دوسری کہانی ہوتی ہے۔ اس لیے قرأت کے دوران قاری کا ذہن مختلف کیفیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس نظم کی خاص بات'' کلام'' ہے جو ایک مرد کا کسی نسائی وجود سے ہے۔ حسن عباسی نے مسلسل ایک ہی وجود کو مخاطب کیا ہے اس لیے ان کا ایک ہی پیکر سے کلام کرنا خود کلامی کے زمرے میں آتا ہے۔ نظم کی کہانی مختلف ادوار اور تہذیب و تمدن کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہوئے عہد حاضر تک پہنچتی ہے۔ نظم کا نمونہ دیکھیے:

تم یونہی کب تک\
سیڑھیوں میں بیٹھی رہوگی\
اُدھر بہتے جھرنوں کے\
پانیوں میں\
رنگین مچھلیوں کے بدن\
تمھاری پنڈلیاں چھونے کو ترستے ہیں\
یہ تو تم بھی جانتی ہو\
دھند میں لپٹے گھنے جنگل کے راستے\
تمھاری سائیکل کے ٹائروں کی خوشبو\
سے بیدار ہوتے ہیں\
تم کب تک یونہی\
برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھی\
بارش کے قطروں کو\
اپنی ہتھیلیوں پر لیتی رہوگی\
آؤ!\
چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے\
سمندر کے کنارے\
پہاڑی قلعے کے پہلو میں\
اُن پتھروں کو چھو آئیں

حسن عباسی نے نسائی کردار اور پیکر کو ایک علامت کی صورت میں استعمال کیا ہے۔ انھوں نے ایک عورت کو مخاطب کر کے اپنا بیانیہ دلکش بنانے کی سعی کی ہے۔ حسن عباسی کی یہ طویل نظم اساطیری اور سائنسی شعور کی حامل ہے۔ انھوں نے کائنات کے آغاز و ارتقا کی عکاسی کرتے ہوئے غاروں اور پتھروں کے زمانے کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ شاعر نے ماضی کو بہت یاد کیا ہے۔ انھوں نے اپنے بچپن کے سہانے دنوں کو یاد کر کے نظم میں رومانوی طرز احساس بھر دیا ہے۔ حسن نے نظم کی کہانی میں شعریت، نغمگی اور تخیل کا وفور پیدا کرنے کے لیے مناظر فطرت کا زیادہ سے زیادہ ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بہتے جھرنے، رنگین مچھلیاں، بارش کے قطرے، پہاڑی قلعے، گھاس کے میدان، چاندنی رات اور زخمی لومڑی، برسات کے مینڈک، سرما کی بارش، چراگاہوں کی بے لباسی اور اس طرح کے متعدد مناظر اپنی نظموں میں پیش کیے ہیں۔ یہ نظم ڈاکٹر جواز جعفری کی اساطیری، سائنسی شعور اور کائنات کے آغاز و ارتقا کے موضوعات پر کہی ہوئی نظموں کا تسلسل معلوم ہوتی

ہے۔ لیکن حسن عباسی کا انفراد یہ ہے کہ انھوں نے نیا اسلوب، نئے الفاظ، نئی تراکیب اور تشبیہات واستعارات بھی نئے برتے ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری کی ایک کتاب میں کئی نظمیں شامل ہیں جب کہ حسن عباسی کی پوری کتاب ہی ایک نظم پر مشتمل ہے۔ حسن عباسی کی کتاب ''محبت سے کون ڈرتا ہے'' غالباً ایک طویل نثری نظم کی مکمل پہلی کتاب ہے۔

حسن عباسی کی جدید طویل نثری نظم ''محبت سے کون ڈرتا ہے'' عنوان، موضوع، تمثال کاری اور پیکر تراشی کے لحاظ سے جدید نثری نظم کی روایت میں ایک اختراعی درجہ رکھتی ہے۔ حسن عباسی کا اچانک نظم نگاری کی طرف مائل ہونا اور پہلی ہی نظم میں اس طرح کا اسلوب، ہیئت اور موضوع اختیار کرنا یقیناً قابل ستائش عمل ہے۔ انھوں نے پھٹے کپڑوں سے آندھی کے پر باندھے ہیں، چراغ پہن کر گلیوں میں ناچا ہے، رات کی چٹائی، چاند کے چھلکے سے لڈو کھیلنا، کنواری ندی، بیوہ جھیل، کائی کی رسم حنا، اپاہج لمحے، کنواری مٹی، نعش مٹھی میں لانا اور وعدوں کے صندوق جیسے انوکھے، نئے الفاظ ومحاورات استعمال کر کے نظم نگاری میں نئے پن کا احساس اجاگر کیا ہے۔ حسن عباسی کی پہلی طویل نثری نظم ''محبت سے کون ڈرتا ہے'' غیر عروضی نظم کی روایت میں ایک اہم اضافہ اور نثری ہیئت میں طویل نظم نگاری کے لیے محرک اور سنگ میل ثابت ہو گی۔ اردو میں طویل نظمیں لکھنے کی روایت اتنی روز افزوں اور امکانات کی حامل ہے کہ اب حسن عباسی نے نثری ہیئت میں بھی طویل نظم لکھنے کا تجربہ کر ڈالا ہے۔

موت سے فرار

حافظہ زینب خالد / لاہور کالج

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک روز دوپہر کے وقت پیغمبر حضرت سلیمانؑ دربار گاہ بیت المقدس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک آدمی سہما ہوا اندر آیا اس کے چہرے پر خوف اور وحشت تھی۔

حضرت سلیمانؑ نے اس سے پوچھا: کیا ہوا ہے؟ اور تم کیا چاہتے ہو؟ اس شخص نے کہا: اے عظیم پیغمبر میں نے آج حضرت عزرائیلؑ کو دیکھا، ان کی آنکھوں میں میرے لئے ایک غصہ تھا۔ اور مجھے گھور رہے تھے۔ میں ڈر گیا کہ عزرائیلؑ میری جان نکالنے آئے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا: بہت خوب، بہت خوب عزرائیل فرشتوں کے فرشتے ہیں اور خدا کے حکم سے وہ جان نکالتے ہیں اور اللہ کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے بس ممکن ہے کہ میں عزرائیل کو روز دیکھتا ہوں لیکن میں نہیں ڈرتا، تو کیوں ڈرتا ہے مجھے بتا کہ میں کیا کروں تو مجھ سے کیا چاہیے؟ اس شخص نے کہا: ہاں میں ہمیشہ حضرت عزرائیلؑ سے ڈرتا ہوں۔ لیکن آج ان کی نظریں بہت خوفناک تھیں اور مجھے زیادہ خوف آیا ہے۔ اس نے کہا کہ آپ ہوا کو حکم دیں کہ وہ مجھے اس شہر سے کہیں دور لے جائے۔ اس نے کہا کہ یہ میری خواہش ہے۔ اور اس کو پورا کریں اور مجھے اس کی ضرورت ہے۔ آپؑ نے ہوا کو حکم دیا کہ اسے ہندوستان لے جاؤ۔ میں چاہتا ہوں اب چونکہ حضرت عزرائیل نے مجھے اس ملک میں دیکھا ہے میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔ یہ میری حاجت ہے۔ اور برائے مہربانی میری مدد کریں تاکہ میں حضرت عزرائیلؑ اور موت کی گرفت سے بھاگ سکوں۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا: بہت خوب بہت خوب موت اور زندگی میرے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ہوا پر میرا اختیار ہے۔ اور تجھے میری ضرورت ہے۔ اور مجھے اسے پورا کرنا ہوگا اب میں ہوا کو حکم دیتا ہوں کہ تجھے کہیں بھی لے جائے۔ حضرت سلمانؑ نے ہوا کو پیش کیا اور کہا: یہ آدمی جہاں جانا چاہتا ہے اسے وہاں پہنچا دو۔ حضرت سلمانؑ کے حکم سے ہوا نے آدمی کو قالین پر سوار کرتے ہوئے صحرا میں سے گزارتے ہوئے دریا میں سے گزری اور کچھ منٹوں میں اسے ہندوستان کے ایک شہر میں پہنچا دیا اور اتار دیا وہ اترا اور ملازمت کی تلاش میں چل پڑا وہ دن گزر گیا اور اگلے دن حضرت سلیمانؑ نے حضرت عزرائیل سے اپنے دربار میں ملاقات کی اور پوچھا: اے عزرائیل کل ایک ادمی میرے پاس آیا اور تیری شکایت مجھ سے کی۔ اور کہا کہ حضرت عزرائیل مجھے بہت غضبناک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور میں بہت ڈر گیا۔ اس شخص نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ہوا کو حکم دوں ہوا اسے جلدی سے ہندوستان لے جائے اور اس شہر سے دور چلا جائے میں اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اسی لئے میں نے اس سے پھر ہندوستان بھیج دیا لیکن مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اسے کیوں ڈرایا اور اسے اپنے گھر سے الگ کر دیا۔ عزرائیل نے جواب دیا: میرے پاس سوائے خدا کے حکم کی اطاعت کے کچھ نہیں ہے اور میری نگاہیں اس شخص پر غصے اور غضب والی نہیں تھیں۔ میں نے اس شخص کو کل بیت المقدس میں دیکھا اور میں اس کی طرف نگاہ کر کے یہ سوچ رہا تھا۔ کہ کل میں نے اس کی جان نکالنی ہے میں اس وقت اسے بیت المقدس میں دیکھ رہا ہوں تعجب کی بات ہے کہ یہ بیت المقدس میں ہے اور میں اس کی جان ہندوستان میں نکالنی ہے۔ میں خود سے کہہ رہا تھا اگر وہ پرندے کی طرح اڑ جاتا ہے تو یہ شام تک ہندوستان پہنچے گا کیونکہ ابھی اس کی موت کا وقت نہیں ہے میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ وہاں سے چلا گیا لیکن جب مقررہ وقت پر ہندوستان پہنچا تو اس کو ہندوستان میں دیکھا اور اسی جگہ اس کی موت واقع ہوئی اور میں نے اس کی روح کو قبض کر لیا۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا: بس ہر چیز سے بچا جا سکتا ہے لیکن موت سے کوئی نہیں بچ سکتا اسے اس وقت ہندوستان میں ہونا چاہیے تھا اور چونکہ ہوا کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ ہندوستان پہنچ سکے وہ خود ہی چل کر میرے پاس آیا اور اس نے خود ہی اپنے منہ سے مجھ سے فریاد کی۔ اور خود ہی اپنی منزل مقصود تک چلا گیا۔

تم محبت کا استعارہ ہو

شہباز نیرؔ / رحیم یار خاں

دل کے سونے آنگن میں روشنی بانٹتے خواب اور اُن خوابوں جیسے لوگ، جب زندگی میں آتے ہیں تو پل پل محبت کی تسبیح کرتے گزرتا ہے۔ انہی کے نام کا وردِ زباں کی زینت بن جاتا ہے۔ ہونٹ چپ کی چادر تان لیتے ہیں اور دل بولتا ہے۔ آنکھیں اظہار کرتی ہیں اور ہر دھڑکن سے ایک ہی آواز آتی ہے کہ ''تم محبت کا استعارہ ہو''۔

سچے جذبوں کی خوشبو میں گندھا یہ جملہ عصر حاضر کی منفرد اور مقبول شاعرہ لبنیٰ صفدر کے نئے شعری مجموعے کے سرورق پر دیکھا تو خیال آیا کہ جس کتاب کا نام ہی ''تم محبت کا استعارہ ہو'' رکھا گیا ہے اس کے کلام میں کس قدر محبت کی سرشاری کی فضا ہوگی۔

کتاب میں عہد حاضر کے نابغہ روزگار عظیم اور نامور شعراء کی لکھی تقاریظ سے ان کے خیالات سے مزید تجسس مہمیز ہوا۔ شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اپنی ذات سے عشق کی کائنات تک اور عشق کی کائنات سے روزمرہ کے سانحات تک، ہر رنگ شاعرہ لبنیٰ صفدر کے احساس پہ دستک دیتا ہے اور موزوں ہو کر شعروں میں ڈھلتا جاتا ہے۔ یعنی جذبوں کی دھنک اور فنی پختگی کا شدت سے احساس ہوا۔ میرے اس احساس کو کتاب کے فلیپ میں نظم و نثر کا معتبر نام جناب امجد اسلام امجد کے الفاظ نے تقویت پہنچائی۔ فرماتے ہیں:

''تم محبت کا استعارہ ہو'' میں آپ کو جگہ جگہ ایسے اشعار ملیں گے جو خوبصورت اور خیال افروز بھی ہیں اور جنہیں اظہار کی سادگی اور بیان کی سہولت نے مزید پرلطیف بنا دیا ہے۔''

لبنیٰ صفدر کی اسلوب، سادگی اور دلکشی کی نسبت ڈاکٹر صغریٰ صدف صاحبہ کا کہنا ہے کہ:

''اس کی شاعری بیک وقت عام قاری اور ادبی حلقوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے ہاں بے ساختہ پن، تازگی، شگفتگی اور انفرادیت ہے۔''

ان بیانات کی روشنی میں لبنیٰ صفدر کے اشعار پیش خدمت ہیں:

عشق ہوتا ہے زندگی جیسا
آپ کا کیا خیال ہے صاحب
خواب میں آپ کا یہ آ جانا
ہجر گویا وصال ہے صاحب

شاعری کا بنیادی موضوع ازل سے محبت ہے۔ محبت فردِ واحد سے ہو یا تمام خلق خدا سے۔ محبت ہی انسان کو حساس بناتی ہے۔ نادیدہ جزیرے تلاش کرنے اور مہمات سر کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہی محبت لبنیٰ صفدر کے کلام میں خوشبوئیں بانٹتی ملتی ہے۔ وہ محبت کو خود میں نہیں بلکہ خود کو محبت میں گھلتا ہوا محسوس کرتی ہیں تو محبت کے نئے انداز دکھاتے ہوئے کہتی ہیں:

دل کے صفحے پلٹ رہا تھا وہ
میں محبت کے باب میں نکلی

پھر اپنی محبت کی سرشاری کو یوں بیان کرتی ہیں کہ

تیری تصویر ہر کمرے میں رکھ کر
میں گھر کو خوبصورت کر رہی ہوں

لبنیٰ صفدر کے ہاں محبت کا والہانہ اظہار دیکھتے ہوئے محترم نذیر قیصر فلیپ میں کہتے ہیں کہ:

''لبنیٰ صفدر ہمارے انہی گنے چنے چند شعراء میں سے ایک ہیں جن کی شاعری میں محبت کا لفظ محض ایک موضوع کے طور پر نہیں بلکہ ایک قدر (Value) کی صورت میں آشکار ہوتا ہے۔''

اسی ضمن میں جناب ایوب خاور کا کہنا تو یہاں تک ہے کہ:

''اس مجموعے کا میری نظر میں جو مجموعی تاثر ہے وہ یہ ہے کہ لبنیٰ صفدر دراصل خود محبت کا استعارہ ہے۔''

محبت کی وادیوں میں خوشبوؤں کے نغمے کشید کرتی یہ شاعرہ غم کے خارزاروں سے گزرتی ہیں تو درد کی ہر ٹیس کو آنسوؤں میں بہانے کی بجائے شعر میں ڈھالتی ہیں۔ زندگی کے الم انگیز حقائق جان پر جھیلتی ہیں۔ تبھی شعروں میں سچائی ہے اور شاعری میں زندگی رقص کرتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے اس پہلو کو قبلہ عطاء الحق قاسمی یوں واضح کرتے ہیں کہ:

''اس نے شاعری میں اپنا آپ بسر کیا ہے۔ اس لیے شعر اس کے اندر سے اس طرح پھوٹتا ہے جیسے شاخ سے کونپل نکلتی ہے۔''

غم کی انہی کیفیات کے حوالے سے ان کے شعر دیکھیں:

جسم آدھا ہے میرا دنیا میں
آدھا دیوار میں چنا ہوا ہے

ہر دکھ ہنس کر سہ جاتی ہوں
لبنیٰ یہ آسان نہیں تھا

غم کا یہ احساس صرف ان کی اپنی ذات تک ہی محدود نہیں بلکہ ایک حساس انسان ار نمائندہ تخلیق کار ہونے کی حیثیت سے وہ غم جاں سے غم دوراں تک ہر دکھ کا احاطہ کرتی ہیں۔ انہیں اپنے اردگرد تڑپتے اور زندگی کی بنیادی ضرورت تک کو ترستے لوگ نظر آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوابوں کے لیے اپنا آپ نیلام کرتے اور پل پل ٹوٹتے، بکھرتے انسان نظر آتے ہیں تو تڑپ اُٹھتی ہیں۔

لمحہ لمحہ بکھر رہے ہیں لوگ
یعنی قسطوں میں مر رہے ہیں لوگ
ہر ایک آنکھ سوالی نکلی
ہر اک ہاتھ میں کاسہ نکلا

زمانے کے ظاہری دکھوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کے باطنی غم بھی انہیں کرب میں مبتلا کرتے ہیں تو وہ بول اُٹھتی ہیں:

کیسے دورا ہے پہ انسان آ گیا ہے آج کا
جانتا کچھ بھی نہیں تو آگہی بھی کم نہیں

ہمارے ادراک کی ظاہری و باطنی معاملات تک رسائی خدا تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک ہے۔ ان کا خوبصورت اظہار وہی کر سکتا ہے جسے زندگی کا شعور ہو، جینے کا سلیقہ ہو۔ لبنیٰ صفدر کی ذاتی زندگی میں معاملہ فہمی اور ادیبانہ فکر کے حوالے سے جو اشارہ ہمیں محترم حسن عباسی کے فلیپ میں ملتا ہے وہ لبنیٰ صفدر کی ذات اور کلام کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ کہتے ہیں:

''وہ روزمرہ زندگی کے معاملات میں جتنی سلیقہ شعار ہے اس نے شاعری بھی اُسی سلیقہ مندی سے کی ہے۔''

جناب حسن عباسی کے کہنے کی دلیل لبنیٰ صفدر کے اس شعر میں موجود ہے جو کہ اقدار کی پاسداری، جینے کا قرینہ اور انسانیت کی معراج کے رویے سے مزین ہے۔ دیکھیں:

یہ رویہ معاف کرنے کا
تم کو لبنیٰ بڑا بنائے گا

لبنیٰ صفدر انسانوں کے ساتھ ساتھ اپنے ماحول اور اس میں دوسری سانس لیتی مخلوقات کے درد کو بھی محسوس کرتی ہیں اور کہتی ہیں:

مر نہ جائیں یہ پیڑ، پنچھی میرے
اب تو بارش کی کچھ خبر آئے

منفرد اور تازہ کاری سے مرصع شعر کہنے والی شاعرہ لبنیٰ صفدر کے کلام کی رعنائیوں سے آگاہی کی یہ ایک کوشش کی ہے۔ آخر میں انہی کے دو اشعار کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

اے خدا زمین پر زندگی کی خیر ہو
آدمی کے ہاتھ سے آدمی کی خیر ہو
دوستوں کا ہو بھلا، دشمنوں کا ہو بھلا
میری ہے دعا یہی ہر کسی کی خیر ہو

خالد مسعود/ لاہور

سنتے ہیں ہم ازل سے آشفتگی کی باتیں
کرتے ہیں آج آؤ وارفتگی کی باتیں
کرتے نہیں عبادت نہ بندگی کی باتیں
اپنی تو ساری باتیں شرمندگی کی باتیں
پچھتائے گا یقیناً دل توڑ کے تو میرا
کون اس طرح کرے گا وارفتگی کی باتیں
دیکھا نہیں کہیں بھی کچھ ایسا اپنا پن بھی
کرتے ہو جس طرح سے برجستگی کی باتیں
بدحالئ وطن کا کیا تذکرہ کریں ہم
بے چارگی کی باتیں، درماندگی کی باتیں
میرے کریم کے تو دروازے سب کھلے ہیں
خلقِ خدا کرے ہے بیگانگی کی باتیں
مسعود کیسے کیسے موتی غزل میں ٹانکے
تری شاعری کی باتیں ہیں زندگی کی باتیں

....

ہے خموشی لاجواب اُن کا تکلم لاجواب
اُن لبوں پر جچتا ہے سچ مچ تبسم لاجواب
ایسے بھی چمکے فلک پر زندگی میں آفتاب
جیسے جیسے وقت گزرا اُن کی دیکھی آب و تاب
کم بہت ہی کم ہوا کرتا ہے ایسا اتفاق
وہ بھی ہوں جب ہم رکاب اور دل بھی ہو جب ہم رکاب
کیا قیامت ہے کہ شاہ وقت بھی حیران ہے
کیا گھڑی یہ حشر کی ہے کیا یہی ہے انقلاب
جس کا اندر اور ہو اور جس کا باہر اور ہو
ہو نہیں سکتا کبھی وہ زندگی میں کامیاب
شوخ جب وہ بام پر آ کر دکھائے حسن کو
سامنے آتا نہیں پھر شرم سے یہ ماہتاب
شرم سے پلکیں جھکی ہیں شرم سے چہرہ چھپا
ہم سے ہے مسعود پردہ اور نقاب اندر نقاب

سچّائی کی زبان......ڈاکٹر اخلاق گیلانی

محمد امین ساجد سعیدی/ حاصل پور

20 میں حضور داتا گنج بخشؒ کے سالانہ مشاعرہ منقبت بموقعہ عرس مبارک سید اخلاق محمود گیلانی شاہ صاحب کی زیارت ہوئی۔ ماہنامہ ارژنگ لاہور میں گاہے گاہے ان کی حمد، نعت چشم نوا ہوتی رہتی ہے امسال برادر طریقت وسیم ممتاز سعیدی ایڈووکیٹ کے سکونت کدے پر دبستانِ وارثیہ کے نعتیہ مشاعرہ میں سید اخلاق گیلانی صاحب کی اخلاق آمیز شفقت سے راقم مستفیض ہوا شاہ صاحب نے راقم کو بہت سی اپنی تصانیف کا تحفہ عطا فرمایا

کتب کی ورق گردانی سے راقم کے خیال میں نثری پہلو بھی نمایاں نظر آیا کیونکہ پہلے تو شاعری کی تصویر ذہن کے حاشیہ خیال پر نقش تھی۔

''سچائیاں'' جو کہ 135 افسانوں کا 176 صفحات پر مشتمل خوبصورت مجموعہ ہے کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ راقم جیسے جیسے پڑھتا گیا ان کے انداز گرہ گیر کا اسیر ہوتا گیا۔ افسانچے کیونکہ خال خال پڑھنے کو ملتے ہیں۔ غزلیات اور دیگر شاعری کی چاشنی کی بہتات ہے۔

سید اخلاق گیلانی نے اس مشکل صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی اور خوب کی ہے ہر افسانہ پیش رو افسانے سے منفرد اور الگ پیش خیمہ محسوس ہوتا ہے ہر افسانہ جہاں دلچسپ ہے وہاں اپنے اندر ایک پیغام بھی رکھتا ہے سید اخلاق گیلانی صاحب نے اجلے اجلے اور نکھرے نکھرے جملوں سے گردشِ دوراں کی بے رُخی، معاشرتی اور سماجی تلخیوں اور بے راہ روی کی سیاہ گرد کو نہایت آسان اور سلیس اسلوبِ سخن سے ہٹانے کی کامیاب کاوش وکوشش کی ہے۔ اس حوالے سے نواب رونق جمال، ڈاکٹر عظیم راہی محمد بشیر مالیر کوٹلوی نے ان کے فکر وفن کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے اسلم جمشید پوری (انڈیا) نے بھی شاہ صاحب کو خوب اور بجا حوصلہ افزائی فرمائی ہے ایسے جامع مختصر اور گراں قدر الفاظ استعمال کیے ہیں یعنی کوزے کو دریا میں بند کر دیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں ''مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر گیلانی کے افسانچے افسانہ نگاری کے میدان میں ایک لطیف جھونکے کی مانند ہیں جو قاری کے ذہن ودل کو تازگی بخشتے ہیں۔

بڑی حد تک تو افسانچوں کے اچھوتے پُر معانی عنوانات سے قاری چونک اٹھتا ہے اور مکمل افسانچہ پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کتاب کی ابتدا میں اکثر مضامین جو لکھے جاتے ہیں وہ کچھ اور ہوتے ہیں اور کتاب کے اندر کچھ اور ہوتا ہے شائد مضمون نگار کتاب یا مسودہ پڑھتے نہیں ہی جو رسمی الفاظ ہوتے ہیں وہ ہر کتاب پر صادر آتے ہیں لکھے جاتے ہیں لیکن سچائیاں (افسانچے) ان خوش نصیب کتابوں میں ہے جن پر وہی کچھ لکھا گیا ہے جو کتاب کے اندر حقیقت ہے۔

جہاں ضرورت محسوس کی وہاں برمحل محاورات کا استعمال کیا گیا ہے قاری پر اپنی علیت کی ملمع کاری سخن طرازی کا جادو جگانے کے لیے مشکل الفاظ کا استعمال نہیں کیا گیا۔ نہ ہی علمی وادبی معیار اور وقار کو مجروح کرتے ہوئے اپنی سطح سے نیچے آ کر بات کی ہے۔

چیدہ اور چنیدہ حروف ومعانی سے وابستہ رہ کر مافی الضمیر بیان کیا ہے بے جا طوالتِ صحت بھی سید اخلاق گیلانی صاحب کے پیش نظر رہی ہے جس سے افسانچوں کا حُسن برقرار رہتا ہے۔ یہی ایک اچھے صاحب قلم لکھاری کا شباب ہوتا ہے۔

''لکھاری'' یہ افسانچے شاہ صاحب کے مشاہداتی اور تجرباتی نچوڑ کا عکاس ہیں۔

افسانچوں کے مطالعہ سے قاری کی طبیعت پر کبھی خوشی اور مسکراہٹ اٹھکیلیاں کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے کبھی طبیعت رنج والم سوزِ دروں کی لپیٹ میں آجاتی ہے بحرِ حقیقت کی گیرائی اور گہرائی سے سچائیوں کے موتی غوطہ زن ہو کر نکالے گئے ہیں جو عصر حاضر میں بہت بڑے علمی ادبی سرمائے اور شہ پارے سے کم نہیں۔

افسانچوں میں جس طرح کا مکالماتی لفظوں کا استعمال کیا ہے ماحول، لب ولہجہ، علاقائی ثقافت، زبان و بیان، انداز تکلم اور روایتی اسلوب لیے سید اخلاق گیلانی صاحب نے بہت قریب ہو کر حرف و صوت کے آہنگ سے قاری کے ساتھ جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں درج ذیل الفاظ خاطر نشین کیجئے جس سے شاہ صاحب قلم کاری کا حق ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کتوں کی وفا، پاکی پلیدی، اوساب، ہڈحراموں، پینڈو، دھرم اور پروردگارا، اوے پاگلا، گناہ، ہم کو بولتا ہے، سبز نشہ، ہمارا اپنا زبان ہے، سیٹھ گردھاری لال، آج گھر میں بھوک ہے، پتا جی باہر ایک نیا پلید آگیا، تم تو اتنا خوبصورت تھا، جونیئر مرشدوں کا وزن، کیا آل اوال ہے، یہ سب وقت وقت کا بات ہے، چیلے چانٹے، باؤ جی منہ لٹک گئے، جا دفع ہو جا، گسا پٹا موضوع، ام کچھ نہیں کر سکتے، بک بک جھک جھک، حرامزادے بھگتانے پڑے، مفت خورے

مضمون کی طوالت کے خوف سے آخر میں صرف ایک افسانچہ تحریر کر کے اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کے طفیل سید اخلاق گیلانی شاہ صاحب کے قلم میں مزید روانی اور حسن اور برکتیں عطا فرمائے جس سے معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ خوبصورت کام کرتے رہیں۔

چھوٹی عمر کا بڑا شاعر......قاسم خیال

پروفیسر شجاعت علی/بھلوال

میں نے پہلے قاسم خیال کو پڑھا اور پھر قاسم خیال کی شاعری کو حیرت انگیز طور پر دونوں میں بے حد مطابقت پائی دبلی پتلی جسامت کا یہ لڑکا پیدائشی ادیب لگتا ہے اس کی چال ڈھال اور اسکی گفتار اس بات کی غمازی کرتی نظر آتی ہے کہ اس نے بہت چھوٹی سی عمر میں بہت کچھ سیکھ لیا ہے شاعری اور موسیقی میں کافی عبور رکھتا ہے اسے کئی بحور پہ ملکہ حاصل ہے وہ جب گا تا ہے تو علم موسیقی اس کے گلے سے ٹپکتا نظر آتا ہے اور جب لکھتا ہے تو کئی نام نہاد ادیبوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے بہت چھوٹی عمر میں بہت کچھ کر چکا ہے نظموں اور غزلوں کے علاوہ کئی کتابوں پر تبصرے اور تجزیے لکھ چکا ہے وہ اردو مباحثہ اور غزل و نظم کے مقابلہ جات میں پاکستان لیول تک ون کر چکا ہے وہ ملک کے نامور ادیبوں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش۔ خالد شریف، سعید الظفر صدیقی، عباس تابش، فرحت عباس شاہ۔ اور ڈاکٹر جاوید آغا جیسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھ چکا ہے سوچ کے لحاظ سے بیس سال کی عمر میں چالیس سال کا لگتا ہے قاسم خیال کو لڑکپن کی عمر میں جیسا دیکھائی دینا چاہئے وہ ویسا بلکل نہیں ہے اپنے ہم عصروں کی طرح وہ شوخ اور چنچل بھی نہیں ہے بلکہ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ ہے وہ جانتا ہے کہ کہاں بولنا ہے اور کہاں خاموش رہنا ہے میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ ابھی سے کوئی بہت بڑا ادیب ہے کیونکہ اس کی شخصیت اور شاعری ابھی ارتقائی منازل طے کر رہی ہے لیکن وہ وقت قریب ہے جب وہ پاکستان کے صف اول کے ادیبوں میں شمار کیا جائے گا ٹی ایس ایلیٹ نے فن کو اخفائے ذات کہا ہے یعنی فنکار کے فن میں جو شخصیت اظہار پاتی ہے وہ ظاہر میں نظر آنے والی شخصیت سے مختلف ہوتی ہے گویا فن ایک پردہ ہے جس میں فنکار کے اصلی خد و خال چھپے ہوتے ہیں اسی لیے میں اسے اس کی شاعری میں کھوجتا رہتا ہوں وہ ایک درویش منش شاعر ہے وہ اکثر قبرستان، ریلوے اسٹیشن، اور نہر کنارے پایا جاتا ہے وہ زبان و بیان کا بھی کافی حد تک شعور رکھتا ہے جہاں جہاں اس کے شعری تجربات میں تبدیلی آتی ہے وہاں لفظیات میں بھی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے قاسم خیال کے ہاں علامات جدید رنگ میں اور استعارات نئی ترنگ میں نظر آتے ہیں وہ لفظ کو بوجھل نہیں ہونے دیتا اور نہ ہی ثقیل بناتا ہے بلکہ ایک سادہ پیرائے میں شعر کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتا ہے وہ گل و بلبل کی روایتی قصیدہ خوانی نہیں کرتا بلکہ حسن اس کے نزدیک مظاہر فطرت ہے اسے ہمیشہ اداس اور مرجھائے ہوئے چہروں میں حسن دیکھائی دیتا ہے اسکی شخصیت بھی اسکی شاعری کی طرح سحر انگیز ہے وہ سرتا پا عشق میں ڈوبا ہوا دیکھائی دیتا ہے مجھے اس کی شاعری تصوف اور روحانیت کا ہالہ نظر آتی ہے مجھے آج کے قاسم سے زیادہ کل کے قاسم میں دلچسپی ہے آج سے بیس تیس سال کے بعد اس کا وعروج دیکھنے والا ہوگا اس کی شاعری میں کہیں بھی رنگوں پھولوں اور تتلیوں کا ذکر ہی نہیں ملتا اسکی محبوبہ ڈھونڈ ھونڈنے سے بھی نہیں ملتی لب و رخسار کا ذکر تو کجا اس کے ہاں تو مسکراہٹ بھی خال خال ہی نظر آتی ہے یہ معاشرہ ہی اسکی محبوبہ ہے اور اسکی خوشیاں ہی اسکی خوشیاں اور اس کے غم ہی اس کے غم ہیں اس کے نزدیک شاعر بلاوجہ نہیں بنا جاتا اس کا کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ وہ عورت ہی ہو۔ قاسم خیال کا شعر ملاحظہ ہو۔ شاعر مجھ کو بننا ہی تھا۔ تو جو مجھ میں در آیا ہے بعض دفعہ وہ فلسفی شاعر ہونے کا پتہ دیتا ہے شعر دیکھئے۔ شہ رگ سے وہ قریب ہے کیسے ملوں اسے۔ خود اپنے آپ سے بھی تو واقف نہیں ہوں میں۔ قاسم خیال کی شاعری میں درس حرکت بھی ہے۔ اور سستی سے نفرت بھی۔ بقول خیال۔ اسے کیا خاک منزل مل سکے گی۔ جسے پہلے تھکاوٹ ہو رہی ہے قاسم خیال کے کلام میں سے چیدہ چیدہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ کیسی بات کرتے ہو یہ کیسا عدل ہے واعظ
یہاں بچوں سے خود منصف غبارے چھین لیتے ہیں

اشنان تری آنکھ کی گنگا میں کیا تھا
پھر کیسے کوئی پاپ مری ذات میں ملتا

اب خون کے رشتوں میں بھی احساس کہاں ہے
بچہ سگے بھائی کا سنبھالا نہیں جاتا

وہ اتنا گر گیا تھا زمانے کے سامنے
میری انا سے جھک کے اٹھایا نہیں گیا

اڑنا ہوا میں کوئی بڑی بات ہے کہاں
یہ معجزہ تو میرے بھی دست ہنر میں ہے

یوں تو میں ترے بعد کئی بار ہنسا ہوں
لیکن یہ تبسم مرا بے جان رہا ہے

اپنوں نے نکالا ہے مجھے جس طرح قاسم
ایسے تو کوئی گھر سے نکالا نہیں جاتا

تو اپنی حرکتوں سے باز آ جا
مرے دل سے اترتا جا رہا ہے

سکوت شب میں قاسم جی امیروں کے فلیٹوں پر
کئی مجبور جسموں کی قبائیں رقص کرتی ہیں

بچوں نے بیچ ڈالا متاع حیات کو
بوڑھے سے اک درخت بچایا نہیں گیا

فقط اک شخص کی چالاکیوں سے
مرا کنبہ بکھرتا جا رہا ہے

مختار علی/ملتان

محمد مختار علی 11 نومبر 1972ء کو پاکستان کے معروف خطاط و اَدیب ابنِ کلیم احسن نظامی کے گھر پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ مسلم ہائی سکول ملتان سے میٹرک، سول لائنز کالج سے ایف اے اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے بی اے کیا، اس کے علاوہ دبستان فروغ خطاطی رجسٹرڈ ملتان اور انجمن خوشنویسانِ ایران سے خطاطی کی تربیت حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی ہی سے شاعری، صحافت اور کمرشل ڈیزائننگ کا آغاز کیا۔ 1990ء سے 2000ء تک مختلف اخبارات و جرائد میں ملازمت اختیار کی اور ملتان سے ایک اَدبی جریدے ''میزان'' کا آغاز کیا۔ 1994ء میں پہلا شعری مجموعہ ''کتابِ آئندہ'' ملتان سے شائع ہوا۔ دیگر شعری مجموعوں میں ''کمیاب'' اور ''قرضِ ہنر'' لاہور سے شائع ہو کر اہلِ سخن سے داد پا چکے ہیں۔ 1993ء میں بی بی سی لندن کے عالمی مقابلۂ شعر گوئی میں دنیا کے 10 دس بہترین نوجوان شعراء میں اِنتخاب ہوا۔ 2012ء میں بیرونِ وطن اُردو زبان و اَدب کے فروغ کے اعتراف میں کراچی میں منعقدہ فیض صدی عالمی کانفرنس میں فیض احمد فیض ایوارڈ سے نوازا گیا۔

عالمی اُردو مرکز جدہ کے زیرِ اہتمام شائع ہونیوالے پہلے اُردو مجلّے ''دنیائے اُردو-2006ء'' اور پاکستان قونصلیٹ جدہ کے زیرِ اہتمام منعقدہ کل پاکستان مشاعرہ/مجلّہ ''جہانِ سخن-2015ء'' کی مجلسِ ادارت میں شامل رہے۔ محمد مختار علی کا کلام پاک و ہند کے معروف اَدبی جرائد میں تسلسل سے شائع ہو رہا ہے۔

دِلوں سے درد، دُعا سے اَثر نکلتا ہے
یہ کس بہشت کی جانب بشر نکلتا ہے

پڑا ہے شہر میں چاندی کے برتنوں کا رواج
سو اِس عذاب سے اب کوزہ گر نکلتا ہے

میاں یہ چادرِ شہرت تم اپنے پاس رکھو
کہ اِس سے پاؤں جو ڈھانپیں تو سر نکلتا ہے

خیالِ گردشِ دوراں ہو کیا اُسے کہ جو شخص
گرہ میں ماں کی دُعا باندھ کر نکلتا ہے

میں سنگِ میل ہوں پتھر نہیں ہوں رَستے کا
سو کیوں زمانہ مجھے روند کر نکلتا ہے

مرے سخن پہ تو دادِ سخن نہیں دیتا
تری طرف مرا قرضِ ہنر نکلتا ہے

سخنورانِ قد آور میں تیرا قد مختارؔ
عجب نہیں ہے جو بالشت بھر نکلتا ہے

نغمگی جیسے کسی ساز کو زندہ کر دے
اِک سماعت مری آواز کو زندہ کر دے

پر شکستہ ہوں مگر جست تو بھر لوں شاید
یہی کوشش مری پرواز کو زندہ کر دے

ہم اُسی عشق کی شمشیر سے گھائل ہیں کہ جو
بعض کو مار دے اور بعض کو زندہ کر دے

عین ممکن ہے کہ انجامِ سفر سے پہلے
حرفِ کُن پھر مرے آغاز کو زندہ کر دے

عشق میں جذبۂ فرہادؔ کو معیار بنا
شعر میں میرؔ کے انداز کو زندہ کر دے

یہی اُجڑا ہوا منظر یہی بجھتا ہوا دیپ
جانے کب میری تگ و تاز کو زندہ کر دے

قحطِ آدم ہے یہاں بھیج کوئی شاہؔ لطیف
یا مجھی میں کسی شہبازؔ کو زندہ کر دے

کیا عجب ہو یہی پیرایۂ سادہ مختارؔ!
تیرے لکھے ہوئے الفاظ کو زندہ کر دے

زباں کے سخت مگر دِل کے پیارے ہوتے ہیں
ذرا ذرا سے منافق تو سارے ہوتے ہیں!

دیارِ عشق کا اُلٹا نظام چلتا ہے
یہاں کے سارے منافعے، خسارے ہوتے ہیں

تم اپنی رائے بدلنے میں حق بجانب ہو
ہر آدمی نے کئی روپ دھارے ہوتے ہیں

انہیں کی جیت کا اعلان وقت کرتا ہے
محبتوں میں بظاہر جو ہارے ہوتے ہیں

گر آسماں کی بلندی سے دیکھئے مختارؔ
زمیں پہ جلتے دیئے بھی ستارے ہوتے ہیں

آسماں یا زمیں طواف کرے
جو جہاں ہے وہیں طواف کرے

کعبۂ عشق بے نیاز سہی
دِل تو اپنے تئیں طواف کرے

رنگ اُس کا طواف کرتے ہیں
جب کوئی مہ جبیں طواف کرے

طائرِ خوش نوا ہو نغمہ سرا
اور حرم کا مکیں طواف کرے

اُس گماں سے ہمیں ہے نسبتِ عشق
جس گماں کا یقیں، طواف کرے

ریت چھلکائے زمزمے مختارؔ
جب وہ صحرا نشیں طواف کرے

انجینئر ظفر محی الدین/لاہور

چاند تارے کہاں سے آتے ہیں
اتنے پیارے کہاں سے آتے ہیں
تتلیاں کون بھیجتا ہے یہاں
پھول سارے کہاں سے آتے ہیں
جان دیتے ہیں دیکھ کر جن کو
وہ اشارے کہاں سے آتے ہیں
نفع ملتا ہے کس کی جانب سے
اور خسارے کہاں سے آتے ہیں
کون نیندیں اُڑاتا ہے اپنی
یہ جگارے کہاں سے آتے ہیں
ڈگمگاتا ہے کون اپنے قدم
پھر سہارے کہاں سے آتے ہیں
ناؤ، دریا، بھنور یہ لہریں ظفر
اور کنارے کہاں سے آتے ہیں

ایک انجانی خوشی ہے یا کہ تم ہو
میرے آگے زندگی ہے یا کہ تم ہو
میری آنکھیں دیکھتی ہیں پیچھے مڑ کر
وادیوں کی دلکشی ہے یا کہ تم ہو
چلتے چلتے اس لیے رُک جاتا ہوں میں
راستوں میں چاندنی ہے یا کہ تم ہو
فیصلہ اس کا نہیں کر پا رہا میں
سامنے میرے خوشی ہے یا کہ تم ہو
کوئی تو مجھ کو بتائے راز کیا ہے
یہ شگفتہ سی کلی ہے یا کہ تم ہو
جس سے روشن بام و در ہیں میرے گھر کے
میرے اندر روشنی ہے یا کہ تم ہو
اب ظفر اقبال یہ بھی دیکھنا ہے
خود سے ہی میری ٹھنی ہے یا کہ تم ہو

قصۂ دل تمام ہونے لگا
یہ فسانہ بھی عام ہونے لگا
جب سے دنیا کو میں نے ترک کیا
آسماں ہم کلام ہونے لگا
میری تنہائی میرے کام آئی
پھر سے میں وقفِ جام ہونے لگا
کچھ شناسائی اس سے بڑھنے لگی
راستے میں سلام ہونے لگا
وہ نظر کیا مری طرف اُٹھی
رُک گیا تھا جو کام ہونے لگا
وقت سے جب نکل گیا باہر
وقت میرا غلام ہونے لگا
جیسے فطرت سے دور ہوتے گئے
ویسے جینا حرام ہونے لگا
بزم میں آج کیوں مری خاطر
خاص کچھ اہتمام ہونے لگا
اُس نے ہم کو پکارا آج ظفر
کچھ تو اپنا بھی نام ہونے لگا

جانے کے باوجود اِدھر سے نہیں گیا
دل سے نہیں گیا وہ نظر سے نہیں گیا
جس دُھن میں ہم مگن تھے اُسی میں مگن رہے
سودا جو سر میں تھا کبھی سر سے نہیں گیا
اس بار موسموں کا تغیّر عجیب تھا
کوئی پرندہ اُڑ کے شجر سے نہیں گیا
دیکھو کمالِ فن کا یہی تو کمال ہے
اوجِ ہنر کبھی بھی ہنر سے نہیں گیا
جس راستے میں تم سے ملاقات ہی نہ ہو
میں عمر بھر دوبارہ اُدھر سے نہیں گیا

اندر کا حال پوچھا نہیں ہے کسی نے بھی
باہر کئی دنوں سے میں گھر سے نہیں گیا
انکار کر نہ دے مجھے پہچاننے سے وہ
مدت کے بعد ملنے میں ڈر سے نہیں گیا
میری سحر کہیں تو مری شام ہے کہیں
کر کے قیام بھی میں سفر سے نہیں گیا
ویسے جہاں بھی جاؤں پہ بیٹھا یہیں پہ ہوں
اُٹھ کر ظفر میں داتا کے در سے نہیں گیا

پورے قد میں رہتا ہوں
اپنی حد میں رہتا ہوں
حاوی ہوں میں صدیوں پر
پل کی زد میں رہتا ہوں
مرشد کامل ہے میرا
غیبی مدد میں رہتا ہوں
اپنے آپ سے جنگ مری
اپنے حسد میں رہتا ہوں
بعد میں ڈھونڈا جاتا ہے
پہلے رد میں رہتا ہوں
خواب جہاں تقسیم ہوئے
اُس سرحد میں رہتا ہوں
ناز اُٹھائے جاتے ہیں
روز رسد میں رہتا ہوں
لکھ لو میرے گھر کا پتہ
سات عدد میں رہتا ہوں
عام سا ہوں انسان ظفر
نیک و بد میں رہتا ہوں

ارشد محمود ارشد/سرگودھا

ہونٹوں کا وہ لال پیالہ چھوڑ دیا
آدھا گھونٹ بھرا تھا آدھا چھوڑ دیا
مجھ سے پیار کے منتر میں اک بھول ہوئی
شہزادی نے باغ میں آنا چھوڑ دیا
اُس کے نام کو وردِ زباں کر لینے سے
رہ میں بیٹھے سانپ نے رستہ چھوڑ دیا
اتنی بے تابی تھی تجھ سے ملنے کی
میں نے ہر اک کام ادھورا چھوڑ دیا
عزرائیل نے دروازے پر دستک دی
اک پنچھی نے اپنا پنجرہ چھوڑ دیا
آؤ ارشد کوئی شہر بساتے ہیں
اب تو مجنوں نے بھی صحرا چھوڑ دیا

دل مرا اس لئے بھی بوجھل ہے
ایک منظر نظر سے اوجھل ہے
آج بھی ہونٹ مثلِ صحرا ہیں
آج بھی آنکھ میری جل تھل ہے
لوگ رستہ بھٹک ہی جاتے ہیں
یہ محبت بھی ایک جنگل ہے
جس نے مجھ کو چرا لیا مجھ سے
ایک لڑکی ہے اور چنچل ہے
اور تو کچھ نہیں کہانی میں
اک حویلی ہے اور مقفل ہے
کوئی جنت چرانے آیا تھا
اس لئے شہر بھر میں ہلچل ہے
یار ارشد تو دھیان میں رکھنا
یہ جو دنیا ہے ایک دلدل ہے

زمیں کی کوکھ سے پہلے شجر نکالتا ہے
وہ اس کے بعد پرندوں کے پر نکالتا ہے
شبِ سیاہ میں جگنو بھی اک غنیمت ہے
ذرا سا حوصلہ اندر کا ڈر نکالتا ہے
کہ بوڑھے پیڑ کے تیور بدلنے لگتے ہیں
کہیں جو گھاس کا تنکا بھی سر نکالتا ہے
پھر اس کے بعد ہی دیتا ہے کام کی اجرت
ہمارے خون سے پہلے وہ زر نکالتا ہے
وظیفہ تجھ کو بتاتا ہوں ایک چاہت کا
جو قصرِ ذات سے نفرت کا شر نکالتا ہے
کہانی لکھتا ہے ایسے کہ اس کا ہر کردار
نکلنا کوئی نہ چاہے مگر نکالتا ہے
میں ایسے شخص سے ارشد گریز کیسے کروں
فصیلِ دل میں جو دستک سے در نکالتا ہے

وفا پرستوں کو بے وفاؤں کا سامنا ہے
چراغِ ہستی کو اب ہواؤں کا سامنا ہے
تری خدائی بجا ہے عرشِ بریں کے مالک
ہمیں زمیں پر بھی کچھ خداؤں کا سامنا ہے
گلی گلی میں جو بھونکتے ہیں سگانِ دنیا
انہیں فقیروں کی بددعاؤں کا سامنا ہے
میں سوچتا ہوں مکین نکلتا نہیں ہے کیونکر
کہ اس حویلی کو سو بلاؤں کا سامنا ہے
چلو کہ دیکھیں جواب دیتی ہے کس کی ہمت
بپھرتے دریا کو تیرے گاؤں کا سامنا ہے
ہماری سانسوں کا یہ تغیّر بتا رہا ہے
تمہارے کوچے کی پھر فضاؤں کا سامنا ہے
بچاؤں کیسے تڑپتے دل کو بتاؤ ارشد
اسے کسی کی حسیں اداؤں کا سامنا ہے

پیرہن جو کم دیا ہے مجھ کو میرے ناپ سے
اس پہ کیا میرا گلہ بنتا نہیں کچھ آپ سے
گرم کپڑوں کی تمنا میں ٹھٹھرتے نونہال
سرد سانسیں چھین لی ہیں بیکسی نے باپ سے
اس سے بڑھ کے اور کیا ہو زندگانی کا جواز
دل کا انجن چل رہا ہے آنسوؤں کی بھاپ سے
ناچنے لگتے ہیں سائے پھر اندھیری رات کے
تھرتھراتا ہے دیا جس دم ہوا کی چاپ سے
ایک بوسے کی طلب دوزخ میں لے آئی مجھے
رات بھر جلتا رہا میرا کلیجہ تاپ سے
روزِ محشر جس خطا کی کوئی بخشش ہی نہ ہو
یا الٰہی ! تو بچانا مجھ کو ایسے پاپ سے
چاہتوں کے گیت ارشد گنگنانا سیکھ لے
یار مہکیں گی فضائیں ایک دن آلاپ سے

راکھ

(عبدالوحید بسمل کے ہندکو افسانے ''ساڑ'' کا اردو ترجمہ)

مترجم: ڈاکٹر تحسین بی بی

اس نے کیشیئر کے ہاتھوں سے تنخواہ اتنی جلدی لینے بلکہ چھیننے کی کوشش کی کہ جیسے وہ کہیں بھاگ جائے گا۔رقم گنے بغیر ہی اپنی قمیض کے نیچے پہنی ہوئی انگیا کی جیب میں ڈالتا ہوا تیز تیز قدموں سے وہ کیشیئر کے کمرے سے نکلا اور دوڑتا ہوا فیکٹری کے مین گیٹ سے باہر نکل کر برق رفتاری سے فیکٹری ایریا کی ٹیڑھی میڑھی سڑک سے ہوتا ہوا سیدھا مین روڈ پر آ پہنچا۔

آج وہ بہت خوش تھا کہ آج اسکی زندگی کا ایک بڑا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کو تھا۔رکشے میں بیٹھا ہوا وہ اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا اور خوشی کی فضاؤں میں تیرتا دیکھ رہا تھا۔اس کا ایک ہاتھ تنخواہ کی رقم والی جیب پر اور دوسرا کئی بار کاغذ کے اس بوسیدہ پرزے کو جیب سے نکال کر پڑھنے اور پھر تہہ کر کے جیب میں ڈال لینے پر مامور تھا جس پر بہت سی فرمائشیں لکھی ہوئی تھیں۔اس نے ایک بار پھر وہ کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور بغیر رکشہ ڈرائیور کی موجودگی کو خاطر میں لائے بے اختیار بول پڑا۔''ہاں، ہاں ضرور۔اسی لیے تو پنوں! ہاں ہاں، بالکل اسی لئے تو میں تمہیں اور اپنی بوڑھی ماں کو گاؤں کے آخری اور ڈراؤنے کونے میں اس اکیلے مکان میں اکیلا چھوڑ کر چند پیسے کمانے لاہور آیا ہوں۔۔۔۔۔ہاں پنوں! ہاں۔۔۔میں تمھاری لکھی ہوئی تمام اشیا لے کر بہت جلد تیرے پاس پہنچ رہا ہوں''۔

جہانزیب انہی خیالوں اور خودکلامیوں میں محو تھا کہ رکشہ ڈرائیور نے پرانی انارکلی کے سامنے ایک جھٹکے سے بریک لگائی اور رکشہ اس کے پورے جسم کو آگے جھکاتا ہوا فٹ پاتھ کے ساتھ جا رکا۔ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر آواز دی۔''لو باؤ جی! یہ سامنے انارکلی ہے نئی اور پرانی خود ہی تلاش کر لیجیے گا''۔

اس نے جلدی جلدی جیب سے پیسے نکالے اور رکشے والے کو کرایہ دیتے ہوئے بولا،''استاد!! اگر تھوڑی دیر یہاں رک سکو تو میں بہت جلدی چند اشیا لے کر واپس آتا ہوں پھر کوچوں کے اڈے تک جانا ہے''۔

''ناں باؤ جی!! ہماری ہوائی روزی ہے، کیا پتہ کب کوئی اور سواری مل جائے اور ہم چل پڑیں۔آپ کسی اور کے ساتھ آ جائیے گا، لاہور میں رکشوں کا کیا کال'' رکشے والا انکار کا اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ ہلا کر بولا اور جہانزیب انارکلی کی رونقوں اور چہل پہل میں گم ہو کر رہ گیا۔تھوڑی دیر تک تو اسے یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہو گیا کہ کونسی چیز پہلے اور کونسی بعد میں لینی ہے اور وہ بھی کہاں کہاں سے؟۔

اس نے کچھ ہی وقت میں کئی دکانیں چھان ماریں پر آج اسے کوئی چیز اپنی محبت کے معیار اور پنوں کے ذوق جمال پر پوری اترتی نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔کبھی ایک اور کبھی دوسری کبھی یہ اور کبھی وہ، کبھی تو وہ کسی دکان میں موجود دوسرے خریداروں سے چیزیں پسند کرواتا اور کبھی کسی دکاندار کو کہتا کہ آپ کے پاس جو سب سے عمدہ اور خوبصورت اشیاء ہیں وہ دکھاؤ۔کپڑے پسند آتے تو جیب ہلکی لگتی، جیب کی مانتا تو چیزوں کا معیار گرنے لگتا، الغرض اسی شش و پنج میں کافی وقت گزر گیا، آخر دل پر ہاتھ رکھ کر اس نے پنوں کی لکھی فرمائشیں پوری کیں اور شاپنگ بیگ لے کر سیدھا کوچوں کے اڈے کو چلا۔

آج وہ راوی کے پل سے گذرتے ہوئے اس کے عمومی خوبصورت مناظر اور راوی کی لہروں میں چاہت کا پیغام لئے شفاف پانی کی روانی سے بھی بالکل لطف اندوز نہ ہو سکا۔کیونکہ اس وقت اس کا تخیلات کی دنیا میں کلابازیاں کھاتا دل کرتا تھا کہ آج اس کوچ کے ساتھ ہوائی جہاز کا انجن لگ جائے اور وہ اڑتی ہوئی سیدھی اس کے گاؤں جا پہنچے جہاں اس کی پنوں اسکی راہوں میں پھول بچھائے اس کی ایک جھلک دیکھنے کو تڑپ رہی ہوگی۔

پنوں اس کی بہت ہی پیاری اور لاڈلی بیگم اور اس کا باپ جیسا خیال رکھنے والے ماموں، فیض عالم کی اکلوتی بیٹی ہی نہ تھی بلکہ اس کی بچپن کی ہم خیال اور من پسند بھی تھی جس کی خاطر وہ زندگی کی ہر مشکل کو برداشت کرنا اپنی خوشی سمجھتا تھا۔

کوچ اپنی پوری رفتار سے رواں دواں تھی۔

رات کے اس پر کیف سمے، جہانزیب کچھ دیر کے لئے کھڑکی سے باہر جنوں بھوتوں کا نقشہ پیش کرتے ہوئے بھاگتے درختوں پر نظر ڈالتا اور کبھی پنجاب کے سرسبز و شاداب، فصلوں بھرے کھیتوں کے حسن بے مثال پر مگر اندر سے اس کو اسکے بچپن کے وہ سارے مناظر مچل مچل کر تڑپا رہے تھے جن میں پنوں کی کہیں معصوم اور کہیں چنچل یادیں، کہیں قربانیاں اور کہیں خلوص اور چاہت سے بھرے صاف ستھرے جذبے رچے بسے تھے۔کوچ کا یہ آٹھ گھنٹے کا سفر اگرچہ رات کو ٹریفک کی نسبتاً کمی کی بنا پر سات گھنٹوں میں طے ہو گیا مگر جہانزیب کو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سات گھنٹے سات سال ہو گئے ہوں۔اپنے سٹاپ کے قریب آنے سے کافی پہلے جہانزیب نے اپنے سامان پر نظر ڈالی۔تھیلوں کو جھاڑ کر راستے کی گرد وغیرہ سے آزاد کیا اور اترنے کی تیاری کرتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔''بس استاد جی! میرا سٹاپ آ گیا، وہ آگے جو چھوٹی سڑک اوپر کو جاتی ہے وہاں گاڑی روک دیں۔اگرچہ کوچ ڈرائیور اپنے مخصوص اڈوں پر ہی رکتے ہیں مگر اس کوچ کے ادھیڑ عمر ڈرائیور کو بھی شاید جہانزیب کی عجلت و بے چینی نے اپنے سحر میں لے لیا

اور وہ گاڑی روکتے ہوئے مسکرا کر پنجابی میں بولا۔'' آرام نال سوہنڑیا! کتھے ڈِگ نا پئیں۔۔۔''

جہانزیب پر تو گویا ایک بھوت سوار تھا کہ کسی نہ کسی طرح گھر پہنچے اور پنوں کے انتظار کی الجھن ختم ہوتی دیکھے۔ کوچ سے اتر کر سیدھا اپنے گاؤں کی پرانی کھنڈرہ نما، دھکا سٹارٹ قسم کی جیپوں کی طرف لپکا۔ دو تین ڈرائیور، کنڈیکٹر نزدیک آ کے سلام دعا کرنے لگے جو اسی گاؤں کے باسی اور جہانزیب کے ہم جھولی تھے۔ اس نے عام سواریوں والی گاڑی پر جانے کی بجائے پوری گاڑی بکنگ پر لے جانا پسند کیا تا کہ جتنا جلدی ہو سکے وہ پنوں کے پاس پہنچ جائے۔

آج اسے گاؤں کا کچا راستہ رفتار میں کمی کا سبب بنتا نظر آ رہا تھا۔ وہ کبھی اپنے حلقہ کی ارباب اختیار کی بے حسی اور بے توجہی پر برہم ہوتا اور کبھی اپنے گاؤں کے سادہ لوح ووٹروں کی بلا سوچ وفکر سیاسی دوڑ پر۔ گاڑی کا ڈرائیور گاؤں کے کٹے پھٹے راستے سے گاڑی کو ہچکولوں اور گرد سے بچاتا ہوا آہستہ آہستہ چلا رہا تھا جبکہ جہانزیب کا دل اچھل اچھل کر کہہ رہا تھا کہ گاڑی ایک ہی جست لگائے اور سیدھی پنوں کے سامنے جا رکے۔ آخر وہ چپ نہ رہ سکا اور ذرا سخت لہجے میں بولا۔'' ابے یار! اس کے زخم تو کھلنے کا ڈر نہیں ہے کہیں؟۔ ذرا تیز چلا۔ مجھے یوں آہستہ آہستہ رینگنا ہوتا تو عام سواریوں والی گاڑی پر نہ آتا''؟

'' جی بابو جی! میں تو آپکے صاف ستھرے کپڑوں پر دھول پڑ جانے کے ڈر سے آہستہ چلا رہا ہوں ورنہ یہ راستہ تو دس منٹ کی بات ہے'' گاڑی کے ڈرائیور نے ریس دے کر گیئر بدلتے ہوئے بولا اور پھر گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ اس کی جگہ اڑنے والی دھول اور خاک کا ایک ایسا دھواں تھا جس نے چاروں اور اندھیرا ہی اندھیرا بکھیر رکھا تھا۔

گاؤں پہنچ کر گاڑی سے اترتے ہوئے پھر ایک بار اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ آج اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی حسرت کے پورا ہونے پر آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ اسکی پنوں اسے اپنے انتظار میں کھڑی، بانہیں پھیلائے، مسکراہٹیں بکھیرے، صدقے واری جاتی، ہاتھوں سے اپنی فرمائشوں سے بھرے تھیلے جھپٹ کر چھینتی نظر آنے لگی تھی۔ وہ عام رفتار سے چلنے کی بجائے اپنے گھر تک جاتی پگڈنڈی پر یوں دوڑنے لگا جیسے وہ بچپن میں پنوں کے ساتھ گاؤں کے چشمے سے پانی بھرنے جایا کرتا تھا۔

سورج اپنی پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ مطلع ایسا صاف تھا جیسے آئینہ اور جہانزیب آج بہت دور کے پہاڑی سلسلے کے وہ مناظر بھی بڑی صفائی سے دیکھ پا رہا تھا جو آگے پیچھے دھندلے ہوا کرتے تھے۔ آج اسے گاؤں میں نظر آنے والی ہر شئے پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور پیاری لگنے لگی تھی۔ جھاڑیوں اور درختوں پر چہچہاتے پرندے، بلبلوں کے رسیلے گیت آج اس کے کانوں میں وہ رس گھول رہے تھے جس کا اسے ایک عرصے سے انتظار تھا۔ اس نے جیب سے کنگھی اور ایک چھوٹا سا شیشہ نکالا، شاپنگ بیگوں کو تھوڑی دیر کے لئے زمین پر رکھا اور اپنے بال سنوارنے کے بعد تھیلے اٹھا کر ایک مسلسل دوڑ لگائی اور سیدھا گھر کے پاس جا پہنچا جہاں پر پگڈنڈی ختم ہوتی تھی اور پھر ان گھڑے پتھروں سے بنی دو تین سیڑھیاں چڑھ کر اس مقام پر جا پہنچا جہاں سے مکان کی چھت ایک بڑے کھیت کے آخری کونے سے جڑی ہوئی تھی اور اسے مکان کی چھت سے گزر کر دوسری جانب سے گھر کے اندر جانا تھا۔ وہ جونہی سیڑھیاں چڑھ کے کھیت کے کونے اور مکان کی چھت پر پہنچا تو اچانک اس کی نظر کھیت کے کونے میں پڑی تمباکو کی بہت سی راکھ پر پڑی، اس کا جسم لوہے کا ہو گیا۔ اسکی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے کانوں میں شوں شوں کی آوازیں آنے لگیں اور سارے خواب ایک دم ٹوٹ کر رہ گئے۔۔

وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی شخص اس کے گھر کے اتنا قریب آ سکتا ہے اور یوں بیٹھ کر چلم (حقہ) پی پی کر تمباکو کی راکھ کے ڈھیر لگا سکتا ہے۔ اس کی ساری خوشیاں راکھ میں مل گئیں۔ اس نے اپنی زبان دانتوں سے کاٹ کاٹ کر خون آلود کر لی۔ دانتوں کو آپس میں پیس پیس کر بلا دیا مگر ماحول کی نزاکت اور پنوں کی عزت کے پیش نظر منہ سے کچھ نہ بولا۔ اسے تو اس بارے میں کسی سے استفسار کرنا بھی پنوں کی ذلت اور بدنامی کا باعث لگتا تھا۔ بس سب کچھ اپنے دل پر سہہ کر سیدھا گھر کی دہلیز پر جا پہنچا۔ قدموں کی چاپ سن کر پنوں جو کہ گھر کی صفائی کر رہی تھی، فوراً دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کے دل میں خوشیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک دم آگے بڑھ کر جہانزیب سے لپٹ جائے مگر جونہی اس نے جہانزیب کی طرف محبت بھری استقبالیہ نظروں سے دیکھا تو چہرے پر اداسی، ہونٹوں پر خشکی اور آنکھوں میں نمی کے سوا کچھ نہ پاتے ہوئے ششدر رہ گئی۔ بے اختیار پوچھ پڑی۔'' کیا بات ہے زیبی؟؟ خیریت تو ہے؟ راستے میں کسی سے کوئی تو تکرار تو نہیں ہو گئی، اتنے اداس کیوں ہیں''؟؟ اسے تو یہ توقع تھی کی جہانزیب ابھی اسے اپنے حصار محبت میں لے کر لاڈ سے بولے گا نہیں پنوں تمھارے سامنے ہوتے ہوئے کوئی پریشانی اگر ہو بھی تو بھول جاتی ہے اور پھر اس کے سامنے اسکی فرمائش کردہ تحفوں کے ڈھیر لگا دے گا مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا اور جہانزیب تھیلے ہاتھ سے نیچے چھوڑتے ہوئے اپنی مردہ سی آواز میں صرف یہی بول پایا کہ'' بے بے جی کہاں ہیں''؟ اور بے بے جی مال مویشی کے

کمرے میں بکری باندھ کر مڑتے ہوئے اپنے لعل پر نظر پڑتے ہی صدقے واری جاتی، بانہیں گھماتی، فرط محبت سے آنسو بھری نگاہوں سے دیکھتی جہانزیب کے قریب آ پہنچی اور جہانزیب کو ایک دم ماں اور مامتا اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آنے لگیں۔ ماں کا والہانہ پیار اور پنوں کی سچی محبت سے لبریز معصوم جذبات بھی جہانزیب کو اس کیفیت سے نہ نکال سکے۔ ماں سے چند رسمی باتیں کرنے کے بعد اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر برآمدے میں پڑی ایک چارپائی پر تھکاوٹ ظاہر کرتے ہوئے لیٹا اور اپنی اجڑتی دنیا کے تمام ممکنہ پہلوؤں پر کروٹیں بدلتا سوچتا ہی رہا پھر سفر کی تھکاوٹ نے اسے کچھ دیر کے لئے ادھوری نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔

جب آنکھ کھلی تو شام ہونے کو تھی۔ جہانزیب جلدی سے اٹھا اور واپس لاہور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ پنوں کی خوشیوں اور ماں کی مامتا کا کے خون ہونے کا حال کوئی اور کیا جانے۔ شاید ہی کوئی ایسا حربہ رہ گیا ہو جو ان دونوں نے نہ آزمایا ہو مگر جہانزیب کسی طور بھی رکنے پر آمادہ نہ ہوا اور اور یہ کہتے ہوئے کہ "ماں مجھے تم سے زیادہ عزیز اس جہاں میں اور کوئی نہیں مگر تمہیں میری قسم کبھی مجھے تلاش نہ کرنا اور نہ ہی مجھے گھر واپس آنے پر کسی بھی صورت میں مجبور کرنا ورنہ میں اپنے آپ کو ختم کر ڈالوں گا" اور اسی شام واپس لاہور چل دیا۔

پھر وہ ہر ماہ ماموں محمد عالم کو پنوں اور ماں کی ضروریاتِ حیات کے لئے ایک معقول رقم ارسال کرتا رہا اور اسی طرح زندگی کے کئی قیمتی سال گذر گئے۔ جہانزیب کے لمبے عرصے تک گھر واپس نہ آنے پر گاؤں میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں مگر کیا مجال کہ کسی کو حقیقت کا پتہ چل سکے۔

پنوں کے دل میں کبھی کبھی شدید شکوک و شبہات جنم لیتے مگر پھر وہ اپنی محبت کی سچائی کا سہارا لیتے ہوئے ان شکوک و شبہات کو شیطانی وسوسوں پر موقوف کرتے ہوئے دل سے جھٹک دیتی۔ سکینہ اپنی مامتا کی شکست کو تسلیم کرنے سے بار ہا انکار کرتی مگر جہانزیب کے رویے نے سارے اندازے غلط ثابت کر رکھے تھے اور پھر وہ دن بھی آگئے کہ پنوں کے سر میں چاندی بکھرنے لگی اور سکینہ کو چلنے کے لئے لاٹھی کا سہارا لینا پڑا۔

لاہور کی مئی، جون کی گرمی اور چھوٹی راتیں بندے کی نیند کب پوری ہونے دیتی ہیں مگر جہانزیب آج اور دنوں کے مقابلے میں بہت پہلے جاگ چکا تھا کیونکہ آج اسے اپنے نئے عہدے کا چارج لینا تھا۔ محنت جہاں بھی کی جائے رنگ لاتی ہے، جہانزیب کو بھی اسکی انتھک محنت اور وفاداری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فیکٹری کے مالکان نے اسکی خدمات کا اعتراف اسے مینیجر کے عہدے پر ترقی دے کر کیا تھا۔

وہ خوشی خوشی اپنی شرٹ استری کرنے لگا تھا کہ باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ حیران رہ گیا کہ آج تک جس دروازے کو سوائے جہانزیب کے کسی نے کھولنے یا کھلوانے کی جسارت نہیں کی اس پر آج کوئی کیسے دستک دے سکتا ہے۔ وہ استری سٹینڈ پر رکھتے ہوئے تیز قدموں سے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ دروازہ دوبارہ کھٹکھٹایا گیا، اس نے جلدی سے دروازے کی کنڈی کھولی، دیکھ کر ششدر رہ گیا مگر قبل اس کے کہ جہانزیب کوئی بات کرتا ماموں محمد عالم کی گرجدار آواز گونجی" جہانزیب تمھاری بدنصیبی شاید تمھیں جہنم تک پہنچا کر دم لیگی۔ کم بخت! ذرا خیال کر، ذرا سوچ کہ فیض عالم، تیرا وہ ماموں، جو تجھے تیرے مرحوم باپ سے بڑھ کر عزیز رکھتا آیا۔ جس نے باوجود میری مخالفت کے اپنی اکلوتی بیٹی تیرے پلے باندھ دی۔ پھر تیری غیر موجودگی میں تیرے گھر کی رکھوالی ساری ساری رات جاگ کر، چلم پی پی کر سیروں تمباکو جلا جلا کر راکھ کے ڈھیر لگا کر کی اور پھر تیرے گھر نہ آنے کے غم میں اپنے آپ کو روگ لگا بیٹھا اور آج بستر مرگ پر تیرے انتظار میں آخری سانسیں لے رہا ہے۔ جہانزیب! مگر تم نے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ اچھا نہیں کیا"۔۔۔

عبدالوحید بسمل

حیا کی رفتنی دیکھی، فقیروں نے کیا پردہ
مگر اس کام نے پردے! ترا تو رکھ لیا پردہ

چراغِ دل کے جلنے میں مزاحم تھا جو مدت سے
شرابِ عشق میں گھولا، جنوں نے پھر پیا پردہ

حیاتِ جاوداں بیٹھی تھی چھپ کر ایک پردے میں
شہادت کے جنوں نے پھر ہٹا کر رکھ دیا پردہ

مزاجِ یار میں دیکھی بلا کی بے حجابی جب
ردائے ذات کے تاروں سے ہم نے جا سیا پردہ

رخ تاباں نے دکھلایا شبابِ حسن کا جلوہ
متاعِ دل لٹا یکدم، رہا اک حاشیہ پردہ

دریدہ در دریدہ جب قبائے یار کو دیکھے
پلٹ کر خود کو بسمل نے مناظر سے کیا پردہ

ریزگاری

نوین روما/لاہور

بیٹا سنو تو سہی اتنا غصہ نہ کرو غصہ حرام ہوتا ہے تم مجھے اپنی ماں کہتے ہو تو ماں کی ایک منت التجا تو سن لو۔ نتاشا کی ماں کی التجائیں مجھے کہیں دور کسی غار کی اندھیری گہرائیوں میں سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔نہیں خالہ جی بس بڑی ہو گئی۔اس بدکار عورت کے ساتھ میرا ایک منٹ گزارا نہیں ہو سکتا۔ میں تو اس کی شکل بھی دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔اس کی مشکوک سرگرمیاں اور یہ اس کا موبائل اس کا پاس ورڈ مجھے نہیں بتا رہی یہ اس کے گناہوں کی کنجی ہے۔ مجھے تو کتنے دن سے سچے خواب آ رہے تھے کہ یہ بدکاری کر چکی ہے۔ غصے میں نہ جانے میں کتنا اونچا بولتا گیا اور یوں لگ رہا تھا میری اپنی آواز سے میرے کان کے پردے پھٹ جائیں گے۔ بیٹا ایک منٹ بیٹھ تو جا ساری زندگی ان زخمی ہاتھوں سے اسے پالا پوسا ہے اب ایسا نہ کر نتاشا کی ماں جیسے ہی میرے قریب آئی۔اندھیری رات اور گلی کے گھپ اندھیرے میں دروازہ کھلا اور میں اندھیرے میں ڈبکی لگاتا ہوا وہاں سے نکل پڑا مجھے اپنے عقب میں نتاشا کی ماں کی دہائیاں سنائی دے رہی تھیں کیونکہ میں اپنا آسمانی حق تین مرتبہ انکے منہ پر مار چکا تھا۔ بیک گراونڈ میں نتاشا بت بنی مجھے نظر آ رہی تھی۔اس سارے معاملے میں اس نے مکمل خاموشی اختیار رکھی تھی۔کتنی بے غیرت ڈھیٹ بنی کھڑی تھی غصے سے میں اپنی مٹھیاں بھینچتا چلا جا رہا تھا۔خبیث کی بچی اکیلی ہوتی تو اس کا منہ توڑ دیتا کسی عاشق کو اپنے حسن کے جلوے نہ دکھا سکتی۔بے غیرت خرافہ، ایسی عورتیں ہوتی ہی آوارہ ہیں سارا دن دفتروں میں مردوں کی قربت میں وقت گزارتی ہیں تو سمجھتی ہیں سارے ہی ان کے ناز نخرے اٹھائیں گے، چار پیسے کیا کماتی ہے اپنی من مانیاں کرتی ہے۔نتاشا کو طلاق دینے کے باوجود میرا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو پا رہا تھا۔طلاق دینے سے زیادہ میرا دل اس کی ہڈیاں توڑنے سے سکون محسوس کرتا۔ ویسے تو جب سے ہماری شادی ہوئی تھی مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس کے منہ پر کتنے تماچے مارے ہوں گے مگر وہ ڈھیٹ کی بچی آگے سے میسنی بن جاتی ایک لفظ نہ بولتی جس سے مجھے اور غصہ آتا۔ اندھیری خاموش گلیوں سے ہوتا ہوا میں چوک کی طرف ہانپتا کانپتا جا رہا تھا۔جنوری کی یخ بستہ رات اپنا زور دیکھا رہی تھی لیکن میری کنپٹیوں سے دھوئیں اُٹھ رہے تھے۔غضب خدا کا یار اگر میں آج تین ماہ کے بعد اس آوارہ کے پاس آ ہی گیا تھا اور میری صرف یہ ڈیمانڈ تھی کہ اپنا موبائل مجھے دو، تو دیکھانے میں کیا موت آ رہی تھی لیکن وہ دھیٹ بن گئی ۔اس کی ماں نے بھی کہا بیٹا دیکھا دے۔لیکن آگے سے تڑ کی بہ تڑ کی جواب دینے لگی۔امی تین مہینے کے بعد یہ آ کے میرے سے حساب لے گا؟ کہ میں نے کیا کیا؟ میں سب کچھ ڈیلیٹ نہیں کر سکتی تھی کیا؟ جب سارا دن مردوں میں رہتی ہوں وہ بُرا نہیں؟ بس سارے گناہ تو جیسے میرے اس موبائل میں ہی قید ہیں نا؟ نہیں دیکھاؤں گی نہیں دیکھاؤں گی۔نتاشا کے جملے میرا دماغ خراب کر رہے تھے۔

انہی سوچوں میں اُلجھتا میں تقریباً چوک میں آ گیا اور ایک آٹو کو ہاتھ دیا۔جی بھائی جان کہاں جائیں گے رکشہ میرے قریب رکا تو رکشے والا بولا۔ بندر روڈ جانا ہے۔میں رکشے میں بیٹھتے ہوئے بولا۔بس جلدی چلا دو اور اس اُڑن کھٹولے کے دروازے تم نے اپنے گھر میں فٹ کرائے ہیں کیا میں نے بیٹھتے ہی اس کی کلاس لی؟

بھائی جان، دروازے لگائے یا نہیں آپ اتنی بڑی شان والے ہیں تو وہ موبائل سے گاڑی کا آڈر لگائیں نا ہمارے غریب چھکڑے میں کیوں سوار ہوئے ہیں اور چار سو لیں گے ہم اس چھکڑ چھک میں آپ کو بندر روڈ لے جانے کا۔رکشے والے نے پان کی پیک دور پھینکتے ہوئے کہا۔اُو بھائی نواب صاحب زیادہ لیکچر نہ دو میں کوئی اور رکشہ دیکھ لیتا ہوں بڑا آیا مجھے لیکچر دینے والا میں نے اُسے بُڑبڑا کر چھوڑ کر آگے نکل گیا۔ میں کئی سالوں کے بعد آٹو کی تلاش میں نکلا تھا میں نے تو اتنے سال صرف نتاشا کی گاڑی استعمال کی تھی اور وہ ہمیشہ پیٹرول کی ٹینشن سے آزاد گاڑی ہوتی تھی۔زہر لگتا تھا مجھے پیٹرول پمپ پر جا کر پیٹرول ڈلوانا۔ مجھے اس کی بدبو بہت ناگوار گزرتی تھی اس لیے آفس سے واپسی پر نتاشا ہمیشہ ٹینکی فل رکھتی کیونکہ اس کے آفس سے آنے کے بعد میں رات گئے گھر سے باہر رہتا تھا اس لیے پیٹرول پمپ، سروس اسٹیشن، یہ تیل بدلی اور مینٹیننس وغیرہ سے میری جان جاتی تھی یہ سارے جھمیلے وہ خود ہی دیکھتی تھی۔اس لیے یہ رکشہ والے کے چار سو روپے مانگنے پر میرا ماتھا ٹھنکا تھا مجھے تو کتنے دنوں سے پیٹرول کے ریٹ کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ میں آگے بڑھتا گیا اور تقریباً اگلے چوک پہنچ گیا میں نے نادانستہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چیک کیا کہ پیسے گن لوں۔جیب سے ہاتھ باہر نکالا تو صرف دس کا نوٹ نکلا، میں اچانک رُک گیا اور باقی ساری

جیبیں بھی کنگال ڈالیں، سائیڈ والی جیب سے پانچ کا سکہ، پچھلی سے دو پانچ پانچ کے اور سارے کل ملا کے صرف چوبیس روپے بن رہے تھے۔ ایک مرتبہ پھر دماغ گھوم گیا۔ یہ کیا ہو گیا؟ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا۔ تین مہینے مختلف شہروں میں گھومتے پھرتے جو جمع کیے تھے سارے اُڑا چکا تھا اور نتاشا کے گھر میں جاتے ہوئے مجھے کبھی پیسوں کی ٹینشن ہی نہیں تھی۔ نہ کھانے کا مسئلہ نہ کوئی اور خرچہ ہر چیز مجھے وہاں کسی ہوٹل کی طرح تیار ملتی تھی۔ اُف یہ جو کچھ ہو رہا اسے نے حیا عورت کی وجہ سے میرے ساتھ ہو رہا ہے۔ شکر کیا سامنے ATM نظر آئی کارڈ انٹر کیا تو مشین نے بتایا آپ کے اکاؤنٹ میں تو کچھ بھی نہیں۔ ارے یار یہ میرے ساتھ ہو کیا رہا ہے اب کیا کروں؟ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میں یہی سوچ رہا تھا کہ اایک چنگ چی میرے قریب آ کر رکا۔ باؤ جی جانا ہے؟ آ جاؤ ٹیشن ٹیشن، چنگ چی والے نے رکشہ سٹارٹ رکھا اور بولا جلدی بے جاؤ۔

کتنے پیسے اسٹیشن کے میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا؟

پندرہ روپے سواری، چھتی کرؤ۔

میں نے غنیمت جانا اور جلدی سے سوار ہو گیا۔

یار آہستہ چلاؤ تم کیا اُڑن کھٹولا ہی سمجھ رہے ہو اسے میں نے غصہ سے چنگ چی والے کو کہا، کیونکہ وہ اتنی زور سے رکشہ چلا رہا تھا کہ میرا سر چھت اور کہنیاں سائیڈ والے لوہے کے راڈ سے بار بار ٹکرا رہے تھے۔ باؤ جی شکر کرؤ ایس ویلے تانوں ایتھوں میں بالیا وے نہیں تے تھوڑی دیر بعد تانوں ایتھوں کچھ نہیں لبنا سی۔ وہ اور جھومنے لگا۔ توبہ ہے میں منہ ہی منہ میں بڑبڑیا اور رکشے کو مضبوطی سے تھام لیا۔ مجھے ایک عرصے سے رکشہ میں بیٹھنے کی پریکٹس نہیں رہی تھی اور نہ ہی اتنی اوپن ائیر میں ٹھنڈ برداشت کرنے کی۔ خدا خدا کر کے اسٹیشن آیا اور میں نے اسے پندرہ روپے دیئے اور آگے بڑھا۔ اب میری جیب میں صرف نو روپے باقی تھے اور مجھے لاہور کے آخری کونے میں جانا تھا۔ میں کافی دیر تک پیدل چلتا رہا تا کہ اس سڑک تک پہنچ جاؤں جہاں سے ملتان روڈ شروع ہوتا ہے، شاید کچھ کم پیسے لگیں۔ جنوری کی یخ بستہ ہوائیں چھریوں کی طرح میرے سینے میں اُتر رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے یہیں نمونیا کا اٹیک ہو جائے گا۔ سردی کے ساتھ ساتھ بھوک کے اٹیک بھی جاری تھے۔ نتاشا کی ماں نے مجھے گرم سوپ، انڈے اور چائے کے ساتھ کیک تو کھلایا تھا۔ لیکن اسے گزرے کافی گھنٹے ہو گئے تھے وہ تو میری لڑائی کے دوران بھی کہہ رہی تھی بیٹا کھانا تو کھا لو تمہاری پسند کا پلاؤ اور چانپیں روسٹ کی ہیں۔ اس حرام خور کو طلاق دینے سے پہلے کھانا تو کھا لیتا اب ساری رات بھوک سے انتڑیاں اکڑتی رہیں گی۔ یہ منحوس عورت میرے لیے مصیبت ہی لے کر آتی ہے۔ نتاشا تو برباد ہو۔ بس میں اسے خوب ساری بددعائیں دینا چاہتا تھا۔ اگلے چوک میں دو تین رکشے تھے جو چوبرجی جا رہے تھے۔ دوسرے نمبر والے رکشے میں پیچھے ایک آدمی بیٹھا تھا میں نے چنگ چی والے کے پاس جا کر کچھ رازدانہ انداز میں پوچھا۔ بھائی جان کہاں تک جاؤ گے۔

چوبرجی اس نے مجھے گھورتے ہوئے دیکھا۔

پیسے کتنے ہوں گے؟ مجھے یہ کہتے ہوئے اتنی شرمندگی ہو رہی تھی جیسے میں منوں مٹی تلے دبا جا رہا تھا۔

کلی سورای والے تیراں روپے، اس نے سپاٹ سا جواب دیا۔ میں نے جیب سے سارے سکے نکالے اور گننے لگا وہ تو صرف نو روپے بن سکے۔ نہیں بھائی رہنے دو۔ میں تو شرم سے مر رہا تھا۔ چنگ چی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی دو عورتیں مجھے گھورنے لگیں۔ اُف ان عورتوں کے سامنے میری کتنی بے عزتی ہو رہی ہے میں پیچھے ہٹ گیا اور سڑک کو گھورنے لگا، چنگ چی والا خاموشی سے مجھے تکنے لگا کچھ دیر سواریوں کا انتظار کرتا رہا پھر بولا۔ اؤ جینے وی نے کوئی نہیں بیٹھ جاؤ۔

میں فوراً اُچھلا تنگ لگا کر چنگ چی کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ چنگ چی میں اونچی آواز میں نصیبو کے گانے چلنے لگے جو میرے سر کے اُوپر لگے کوئی ٹیپ ریکارڈر میں بج رہے تھے۔ سارے راستے میں گجرا گجرا سنتا رہا۔ چوبرجی اُتر کر میں نے اسے اپنی مٹھی میں موجود سارے سکے پکڑائے اور شرمندگی سے شکریہ ادا کر کے جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ اس سارے راستے میں مجھے صرف شرمندگیاں ہی مل رہی تھیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا یہ میرے ساتھ کیا چل رہا ہے۔ میری ہر شرٹ کی جیب میں ہمیشہ پیسے موجود رہتے تھے۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ نتاشا کب ایک شرٹ سے دوسری میں پیسے منتقل کر دیتی تھی اور لعنت ہو میرے پر پھر اُسی کے بارے میں سوچنے لگا۔ سردی اتنی تھی کہ خدا کی پناہ، چوبرجی سے سمن آباد کی طرف چلتے چلتے میرے پاؤں شل ہو چکے تھے سڑک سنسان ہو رہی تھی اور میری جیب میں اب صرف میرا موبائل تھا اور اس بات کا خطرہ تھا کہ کوئی مجھ سے گن پوائنٹ پر اسے چھین ہی نہ لے میں تیز تیز چلتا گیا۔ سامنے سڑک کی نکڑ پر ایک تنہا چنگ چی کھڑا تھا میں پاس سے گزرا تو بولا، آ جاؤ ٹھوکر ٹھوکر۔ میں پاس سے گزر گیا وہ پھر آہستہ آہستہ پیچھے آتا گیا پاس آ کر بولا آ جو آگے کوئی نہیں لبھنا۔ نہیں بھائی دراصل میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں نے شرم سے مرتے ہوئے کہا شکر ہے اس وقت سڑک پر اندھیرا تھا اور وہ میری اُڑی ہوئی شکل

صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا۔ وہ خاموش ہو گیا اور آہستہ آہستہ چلتا رہا، کچھ دور جا کر اسے کوئی سواری نہ ملی تو مجھے کہنے لگا، بیٹھ جاؤ میں اونچ وی خالی رکشہ لے جانا اے۔ میں تو اشارے کا منتظر تھا فوراً بیٹھ گیا وہ رکشہ آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے جا رہا تھا کہ شاید کوئی بھولی بھٹکی سواری مل جائے شاہ نور کے پاس جا کر اسے دو خواجہ سرا ملے جو اگلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔

ہائے پائی! جلدی کر لو ہم تو مر گئیں ہیں سردی میں ٹھٹھرتی ہوئی۔

ثمینہ لے آج تیرے ساتھ اچھی نہیں ہوئی کہا تھا نہ کسی کی بددعا نہ لے، بُرا کرے گی تو فوراً بُرا پائے گی، پہلے والا خواجہ سرا دوسری سے مخاطب ہوا۔

لے میں نے کیا کیا سارا دن رزق کے لیے ماری ماری پھرتی ہوں میرا تو روز حشر کوئی حساب بھی نہیں ہونا یہ تو مرد، عورتوں کے کام ہیں حساب کتاب ،اچھا بُرا ہونے کے میں اس سے آزاد ہوں۔ اور شکر ہی ہے آزاد ہوں عورت ہوتی تو سارا دن ذلیل و خوار ہو کر جب گھر جاتی تو پہلے شوہر کہتا آ گئی اپنے یاروں کے سنگ وقت گزار کے آگے سے جواب دیتی تو منہ تو ڑواتی اور گھر کا کام کاج، بچوں کی دیکھ بھال روٹی بنا، اس کی ماں کو کھلا اس کے ٹبر کو کھلا ہزاروں کام نمٹا کے اس بے غیرت کے پیر دباتی اور پھر رات بھر وہ مجھے میرے بستر میں دباتا، نہ بھئی نہ یہ کنجر خانے سے میں ایسے ہی بھلی ،اُ وپر سے طلاق کے تین بول۔۔۔ان کی تلوار الگ لٹکی رہتی، دوسرے خواجہ سرا نے لمبی تقریر کر ڈالی۔

بے غیرت سا کتنی لمبی زبان ہے اس کی ،ایک رکھ کے لگاؤں اس کو میں دل ہی دل میں کڑتا رہا۔ اسے کیا پتہ مردانہ غیرت کیا چیز ہوتی ہے نامرد کہیں کا۔ خیر ثمینہ تو دیکھ لیں کسی کے ساتھ ناحق کرؤ تو چوبیں گھنٹے میں رزلٹ سامنے ہوتا ہے یہ تجربہ ہے سلطانہ کا پہلے خواجہ سرا نے سینے پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اتنی دیر میں میرا اسٹاپ آ گیا اور میں تقریباً چھلانگ لگاتے ہوئے اُترا اور چنگ چی والے کا شکریہ ادا کرتے گلی میں مڑ گیا۔ آج تو لگا چنگ چیوں کے پل صراط سے ہو کر آیا ہوں۔ میں اپنے کالج کے زمانے میں بیٹھا تھا اس آٹو تانگے میں اور اُس کے بعد آج۔ ایک ایک جوڑ ہلا دیا تھا اس نے اور اُوپر سے ناٹک باز خواجہ سرا کا لیکچر، ہانپتا کانپتا گلی کے آگے پہنچا۔ گلی میں بالکل اندھیرا تھا کوئی سٹریٹ لائیٹ بھی نہیں تھی۔ گھر کے آگے پہنچ کر جیب سے موبائل نکالا اور اسکی ٹارچ آن کر کے لاک کی جگہ دیکھنے لگا ساتھ والے گھر سے ہلکی سی ٹیپ ریکارڈر کی آواز آ رہی تھی۔

کہاں رہ گیا لاک، ہاں یہ۔ جیب میں چابیاں نکالنے کے لیے جیسے ہی ہاتھ ڈالا تو جیب تو سکوں سے ہی چھن چھن کر رہی تھی، اب خالی تھی، اگلی پچھلی، شرٹ کے اُوپر والی ، جیکٹ کی اندرونی جیب ،غرض میں نے تقریباً کپڑے پھاڑ ڈالے، چابیوں کی تلاش میں ، اُف میرے خدایا یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میری چابیاں چابیاں کہاں ہو اُوہ شٹ چابیاں تو نتاشا کے گھر key hanger پر لٹکا آیا، جہاں ہمیشہ سے لٹکا تا تھا ،اُوہ نہیں میرے خدایا، گلی کا اندھیرا اور گہرا ہوتا گیا اور سارے مکان کالے پانی میں تیرنے لگے اور میں اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر ساتھ والوں کے تھڑے پر جا بیٹھا۔ میری دنیا گھوم چکی تھی اور اسی لمحے ساتھ والوں کے گھر سے گانے کی آواز تیز ہوئی۔

۔۔ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔۔۔۔۔

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

شاعر، کالم نویس، سفرنامہ نگار، مترجم
اور ماہنامہ ''ارژنگ'' کے مدیر اعلیٰ

عامر بن علی

کی کتب کے نئے ایڈیشن مکمل اہتمام کے ساتھ
شائع ہو گئے ہیں

☆ چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
☆ سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
☆ محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)
☆ گفتگو (انٹرویوز)
☆ روبرو (انٹرویوز)
☆ آج کا جاپان (سفرنامہ)
☆ جہاں گردی (سفرنامہ)
☆ محبت کے دو رنگ (تراجم)

ناشر: حسن عباسی
نستعلیق مطبوعات
فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور
0300-4489310

پابلو نرودا کے آنگن میں ایک دوپہر

عامر بن علی/ جاپان

اس وقت میں پابلو نرودا کے گھر کے صحن میں بیٹھا ہوں۔ یہ مکان نوبیل انعام

یافتہ انقلابی شاعر اور سیاستدان نے اپنی محبوبہ کے لیے تعمیر کروایا تھا۔ اس رہائش گاہ کا نام بھی نرودا نے اسی حسینہ کی گھنی زلفوں کی نسبت سے رکھا تھا،"لا چسکونا" گھنگھریالے بالوں والی یہ خاتون خوش نوا شاعر کی تین بیویوں کے علاوہ تھی۔ میرے قریب بنچ پر برازیل کا ایک نوجوان شاعر بیٹھا ہوا ہے، ابھی ابھی بتا رہا تھا کہ اس کی ذاتی شاعری فرانسیسی اور ہسپانوی زبان کے علاوہ پرتگیزی زبان میں بھی شائع ہو چکی ہے۔ پابلو نرودا کے آستانے کے بارے میں اس کا کہنا ہے کہ اس گھر کی فضا محبت سے معطر ہے، گھر کی ایک ایک اینٹ سے محبت چھلکتی ہے۔ میں نے اپنا تعارف بطور شاعر کروایا تو کہنے لگا کہ یہ کُنجِ عافیت تو دنیا بھر شاعروں کے لیے ویٹی کن کا درجہ رکھتا ہے۔ ناہموار پتھریلی پہاڑی کے دامن میں واقع اس

مکان کی تعمیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ وہاں پر پہلے سے موجود کوئی ایک درخت بھی نہیں کاٹا گیا، اور پہاڑی کے فطرتی پیچ وخم کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کم وبیش چار کنال کے رقبے پر پھیلے اس مکان کو بناتے ہوئے جس تعمیری مہارت کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ فقید المثال ہے۔ یہ گھر قطعی طور پر مہنگا نہیں لگتا، بالکل سادہ، مگر آرٹ کا ایک شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً یہ مسئلہ پایا جاتا ہے کہ بڑے بڑے گھر مہنگے تو نظر آتے ہیں۔ مگر خوبصورت کم کم نظر آتے ہیں۔ شاید تعمیر کروانے والے مالکان کی خواہش بھی یہی ہوتی ہے کہ مکان مہنگا نظر آئے ،خوبصورت بھلے نہ ہو۔

اس مکان کی سیر سے پابلو نرودا کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک اور پہلو نمایاں ہوتا ہے، اسے فن تعمیر سے بے حد لگاؤ تھا۔ فن تعمیر سے اس کی دلچسپی کا مظہر وہ تین مکان تو ہیں ہی جو اس نے خود ڈیزائن کیے اور اپنی نگرانی میں تین مختلف شہروں میں تعمیر کروائے، ایک اور مکان کا ماڈل اس گھر کی لائبریری، جس کے آنگن میں اس وقت میں براجمان ہوں، پڑا ہوا ہے۔ نرودا اس مکان کو تعمیر کروانا چاہتا تھا مگر وقت نے وفا نہیں کی اور شاعر کا یہ خواب حقیقت کا روپ نہ دھار سکا۔ کیسے دلچسپ پہلو ہیں اس انوکھے گھر کے، جن میں سے ایک یہ پہلو بھی کہ ہر موڈ کے لیے شاعر نے الگ کمرہ بنا رکھا تھا۔ اگر کسی صبح ناسٹلجیا محسوس ہوا تو پھر وہ دن ناسٹلجیا کے لیے مخصوص کمرے میں گزرتا، خوشی اور غمگین موڈ کے لیے کمرے الگ الگ رکھے تھے۔ عین ممکن ہے کہ بعض قارئین کنفیوژن کا شکار ہو جائیں کہ میں نہ جانے دنیا کے کس کونے کا تذکرہ کر رہا ہوں؟ عرض ہے کہ میں اس وقت لاطینی امریکہ کے ملک چلی کے دارالسلطنت سنیاگو سے آپ سے مخاطب ہوں۔

چلی کی وجہ تسمیہ کے حوالے سے سرد موسم اور سالم سبز مرچ سے مشتق ہونے سمیت کئی روایات موجود ہیں۔ اس بارے میں سب سے دلچسپ اور قرین قیاس روایت قدیم مقامی قبائل اور انہی کے نام سے منسوب زبان ماپوچو سے ماخذ ہے۔ ماپوچے زبان میں چلی کا مطلب خشکی کا آخری کنارہ ہے، اسے زمین کا خاتمہ کے طور پر بھی ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تاریخی ماپوچے روایت اس لیے بھی دل کو لگتی ہے کہ زیادہ منطق اور دھرتی سے جڑی ہوئی ہے۔ اگر دنیا کا نقشہ اٹھائیں تو چلی کی پٹی کے آگے بحرالکاہل اپنی اتھاہ گہرائیوں اور بے پناہ وسعتوں سے لبریز نظر آتا ہے۔

یہ ملک کئی لحاظ سے منفرد ہے، لاطینی امریکہ کا یہ واحد ملک ہے جس کے باشندوں کی غالب اکثریت نسلی اعتبار سے یورپی نژاد ہے۔ خوبصورتی اس معاشرے کی مگر یہ ہے کہ نسل پرستانہ رویہ یہاں معدوم ہے۔ اسی سے اندازہ لگا لیجیے کہ

برسوں یہاں سکونت پذیر رہے اور مسلسل رابطے کے باوجود مجھ پر گزشتہ سال یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ ملک کی اکثریتی آبادی یورپی النسل ہے، وہ بھی یوں کہ میں یہاں کے ایک کرنسی نوٹ پر چھپی ایک فوجی افسر کی تصویر دیکھ کر اس کی تاریخ ڈھونڈنے نکلا تھا، تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ سپاہی دارالحکومت سنتیاگو کا بانی اور معمار پیدرو دی بالدیویا ہے، موصوف ہسپانوی نژاد ہیں۔ مجھے تھوڑا تعجب ہوا، کیونکہ مقامی لوگ تو کبھی بھی غیر ملکی نوآبادیاتی حکمرانوں کو اپنا ہیرو تسلیم نہیں کرتے، دنیا کا چاہے کوئی بھی ملک ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی منکشف ہو گئی کہ ملک کی غالب اکثریت ہسپانوی، جرمن، فرانسیسی، و دیگر یورپی ممالک سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں پر مشتمل ہے۔

عالمی تاریخ میں چلی دنیا کا پہلا ملک تھا جہاں آزادی کے حصول کے لیے ریفرنڈم منعقد ہوا، لوگوں کی واضح اکثریت نے علیحدگی کے حق میں ووٹ ڈالا۔ یہ واقعہ بہت ہی مزے کا ہے، ہوا یوں تھا کہ فرانسیسی فاتح جرنیل نپولین بوناپارٹ نے سپین فتح کرنے کے بعد اپنے حقیقی بھائی کو 1808 ،عیسوی میں ہسپانیہ کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ چونکہ چلی میں غالب اکثریت ہسپانوی النسل لوگوں کی تھی اور وہ ہسپانیہ عملدا

ری میں ہی تھا، لہٰذا فرانسیسی نژاد نپولین بوناپارٹ کے بھائی کو لوگوں نے اپنا بادشاہ قبول کرنے سے انکار کیا اور ہسپانیہ سے علیحدگی کا راستہ اختیار کیا، سن 1810 میں عوام نے چلی کی خود مختار حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ آج پونے دو کروڑ آبادی والے اس ملک کا بیس فیصد رقبہ گزشتہ سے پیوستہ صدی کے آخر میں بولیویا اور پیرو سے ہونے والی جنگ کے نتیجے میں چلی نے اپنے قبضے میں لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شمال کے رہنے والے لوگ اپنی شکل وصورت سے پیرو اور بولیویا کے باشندے نظر آتے ہیں۔ ایک دفعہ ہماری سیکرٹری کی والدہ ہمارے شوروم پر آئی تو میں نے پوچھ لیا کہ کیا وہ پیرو کی رہنے والی ہے؟ خاتون نے وضاحت کی کہ وہ میری سیکرٹری کی والدہ ہے، بعد ازاں اس خاتون نے اپنی بیٹی کو احتجاج ریکارڈ کروایا۔ سیکرٹری روسا سگو ویا نے پھر وہی احتجاج مجھ تک پہنچایا کہ میں نے اس کی ماں کو پیرو کی باشندہ کہا ہے، جو کہ شاید نسلی اعتبار سے ان کے نزدیک کمتر قومیت ہوگی، خدا گواہ ہے کہ میں نے جو دیکھا وہی کہا تھا۔ تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو میں نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔

یوں تو پابلو نرودا کے ستیاگو میں واقع جس گھر کے صحن میں بیٹھا ہوں وہ مرجع خلائق ہے مگر ازلا نیگرا والے مکان کی اہمیت زیادہ ہے۔ اول وجہ تو یہ ہے کہ نرودا اور اسکی بیوی متلدے اس گھر کے آنگن میں مدفون ہیں، دوم، نرودا کی دنیا بھر کی سیاحت اور کئی ملکوں میں سفارتکاری کے دوران اکٹھی ہونیوالی سوغاتیں، نشانیاں، عجائبات اور فن پارے، اسی فیصد اس گھر میں موجود ہیں۔ عجیب وغریب اشیاء اکٹھی کرنے کا پابلو نرودا کو بہت شوق تھا، بلکہ جنون کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ گھر کا فرنیچر ایسا ہے کہ کوئی چیز دوسری سے نہیں ملتی، ماسوائے ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں کے، وہ بھی آپس میں تو ضرور ملتی ہیں مگر دنیا میں ایسی عجیب کرسیاں کم از کم میں نے تو اور کہیں نہیں دیکھی ہیں۔ تینوں گھروں میں دو، دو مہ خانے ہیں، جن میں رنگین گلاس اور جام رکھے ہیں، پیلے، سبز، نیلے، سرخ، شاعر کا عقیدہ تھا کہ جام کا رنگ بدلنے سے مشروب کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔

نرودا کے گھروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اسے سمندر سے خصوصی لگاؤ تھا۔ پابلو نرودا فاؤنڈیشن جو اس کے نام سے منسوب ہے، اس کے تینوں گھروں کا انتظام چلاتی ہے، جو کہ اب میوزیم بنا دیے گئے ہیں، اس کی کتابوں کی اشاعت کے اہتمام کے علاوہ دیگر تقاریب ومنصوبہ جات کی دیکھ بھال کرتی ہے، اس فاؤنڈیشن کا مونوگرام مچھلی ہے۔ ازلا نیگرا والا گھر ساحل سمندر پر واقع ہے، گھر کے اوپر ایک کشتی بنی ہوئی ہے جہاں سے کھلا سمندر نظر آتا ہے، اپنے قیام کے دوران بلاناغہ اس کشتی میں بیٹھ کر نرودا کئی کئی گھنٹے سگار پیتا رہتا، شراب پیتا اور شعر گوئی کرتا، عہد ساز شاعر اور کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے ملک کی صدارت کے منتخب امیدوار، عاشق مزاج فنکار کا کہنا تھا کہ ایک خاص وقت کے بعد اس کشتی میں بیٹھے ہوئے وہ خود کو سمندری سطح پر سفر کرتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہے۔ لاچسکونا میں بھی ایک بحری جہاز کا ماڈل گھر کا اہم حصہ ہے، گائیڈ کے بقول نرودا اکثر اس بحری جہاز میں بنے کپتان کے کیبن میں سو جاتا تھا۔ سیاسی جلاوطنی کے دوران اٹلی کے جزیرے کیپری پر نرودا کا قیام رہا، وہاں پر بھی سمندر کے ساحل پر ہی رہائش اختیار کیے رکھی۔ اس قیام اطالوی زبان میں ایک ایوارڈ یافتہ فیچر فلم بھی بنی ہے جس کا نام ''IL POSTINO'' ہے۔ جلاوطنی کے دوران جو ڈاکیا اس کو ڈاک لا کر دیتا تھا نرودا کی اس کے ساتھ دوستی ہوگئی تھی۔ چلی واپسی کے بعد نرودا نے اس ڈاکیے سے فرمائش کی تھی کہ وہ کیپری کے ساحل، سمندر کی لہروں کی آواز ریکارڈ کر کے اس کو بھیجے، جس کی مذکورہ ڈاکیے نے تعمیل بھی کی تھی۔ جس شخص کو ادب کے نوبیل انعام یافتہ لوگ بیسویں صدی کا کسی بھی زبان میں سب سے بڑا شاعر مانیں اور جس کی نظم ''ماچو پیچو کی بلندیاں'' کو میساچیوسٹس یونیورسٹی امریکہ میں شعبہ تخلیقی آرٹ کے سربراہ 'انسانی تاریخ میں سب سے بڑی سیاسی نظم'' قرار دیں وہ شاعر عام زندگی میں بھی عام لوگوں سے اتنا سا تو مختلف ہوگا ہی۔

پابلو نرودا کے گھر جاتے ہوئے ایک گلی کا موڑ مڑا تو سڑک کا نام کنداغ تھا، 21 مئی لاطینی امریکہ کے ممالک میں اہم تواریخ کے نام پر سڑکوں اور گلی محلوں کے نام رکھے جانے کا رواج بہت مقبول ہے۔ 5 اگست، 11 ستمبر، 16 نومبر، 25 دسمبر، یکم جنوری، یہ سب یقیناً تاریخیں ہیں مگر چلی کے ہر دوسرے شہر میں یہ سڑکوں کے نام بھی ہیں۔ پچھلی مرتبہ اس گھر کی سیر ہمیں گائیڈ لڑکی اینخلا نے کروائی تھی، مگر اس بار استقبالیے پر ہمیں برقی ہیڈفون تھما دیے گئے، جن سے آپ اپنی پسندیدہ زبان میں، اس گھر کی تاریخ اور نرودا کی زندگی سے اسے نسبت کے بارے میں تمام اہم معلومات وتفاصیل سن سکتے ہیں۔ کتنا اچھا ہوگا اگر ہماری حکومت اہم قومی ہیروز کے مکانات خرید کر ان کو اسی طرز پر عجائب گھروں میں تبدیل کر دے۔ اس سلسلے میں فیض گھر ایک قابل تقلید مثال ہے۔ فیض احمد فیض کے اہل خانہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے انقلاب ورومان کے عظیم شاعر کے ماڈل ٹاؤن لاہور میں واقع قیمتی مکان کو رضا کارانہ طور پر ایک عوامی مقام میں تبدیل کر دیا ہے۔

کالم

فرصت سے فری لانسنگ تک

لبنیٰ صفدر/ لاہور

انہی دنوں ٹی وی آن کرنے پر نیوز چینل پر دو اکٹھی چلنے والی خبروں نے کسی حد تک دل کو مطمئن کیا، نمبر ایک غیر معیاری یا دوسرے لفظوں میں غیر اخلاقی سائٹس پر سختی سے پابندی پر تیزی سے عمل جاری ہے اور مخصوص ٹیمیں دن رات اس پر کام کر رہی ہیں۔ غیر مہذب اور غیر اخلاقی مزاج رکھنے والوں کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ منفی رجحانات کی حامل ہوتی ہیں اب منفی رجحانات میں کون کون سے شعبہ جات شامل ہیں اس پر الگ سے ایک کالم لکھا جا سکتا ہے خیر کچھ تو عمل در آمد شروع ہوا، غیر اخلاقی مواد کو انٹرنیٹ پر سرچ اور واچ کرنے والے ممالک میں سے پاکستان اولین ممالک کی فہرست میں شامل ہے، افسوس کا مقام ہے کہ ہم اولین نمبروں میں ہمیشہ مائنس پر ہوتے ہیں ہمارے اندر کی پوزیٹو اُبھر کر کم ہی سامنے کیوں آتی ہے، دوسری خبر بھکاری طبقے کے خلاف تھی جن میں جرائم پیشہ افراد کو حراست میں لئے جانے کے بارے میں بتایا جا رہا تھا، میں بارہا ان بھیک منگوں کے خلاف لکھ چکی ہوں، یہ ہم ہی ہیں جو ان کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر اپنی خون پسینے کی کمائی رکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اگر آج ہم ان بھکاریوں کو مفت میں رقم دینا بند کر دیں تو اس نیٹ ورک کو بریک کیا جا سکتا ہے شاید یہ تنہا حکومت کا کام ہے بھی نہیں کیوں کہ اس نیٹ ورک کی حوصلہ افزائی کر کے اس کو آج اتنا طاقتور بنا دیتے ہیں ہمارا بھی قصور ہے، یہ وہ طبقہ ہے جو پیشہ دارانہ اس کام کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ ضرورت سے زیادہ عادت اور ان کا پروفیشنلزم ان کو سڑکوں پر لاتا ہے ورنہ ایسے لاکھوں ضرورت مند ہوں گے جن کے گھر ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے نصیب ہوتی ہوگی لیکن وہ اپنی زبان کھولنے اور اپنے ہاتھ کو پھیلانے سے زیادہ عزت سے بھوکے مرجانا پسند کرتے ہوں گے، بہت سے لوگ ہمارے اردگرد موجود ہوتے ہیں لیکن ہماری لاپرواہی شاید ہمیں پورا منظر دکھا نہیں پاتی خیر ان دونوں مسائل پر حکمتِ عملی پر فوراً عملدرآمد کی اشد ضرورت بھی تھی۔ ان بھکاریوں کے روپ میں اور کتنے مسائل جنم لے رہے ہیں اور کتنے جرائم کی افزائش ہو رہی ہے ہمیں علم بھی نہیں ہوگا۔ آج کل میں ہی ایک اور خبر ٹی وی پر چل رہی تھی جس میں ایک نوجوان کو دوسرے نوجوان نے ایک خواجہ سرا کی مدد سے قتل کر کے پھینک دیا، خواجہ سرا طبقہ بھی مظلوم ضرور ہے لیکن جرائم میں ملوث ہونے کی خبریں بھی ملتی رہتی ہیں اس تفصیل میں جانے کا مقصد یہ بھی ہے کہ اگر انسان عزت اور حلال کی کمائی کھانا چاہے تو اس کے سامنے بہت سے دروازے کھلے ہوئے ہیں یہ لوگ محنت مزدوری کر سکتے ہیں، چھوٹے موٹے کام کر سکتے ہیں، دوسری طرف پڑھا لکھا طبقہ ہے جو بے روزگار نظر آتا ہے۔ نوکریاں ملنا جوئے شیر لانے کے برابر ہو چکا ہے، ایسے میں انٹرنیٹ نے بہت ساری آسانیاں پیدا کر دی ہیں، دنیا بھر میں انٹرنیٹ پر بزنس کر کے لوگ لاکھوں ڈالرز بھی کما رہے ہیں آپ کے پاس Skill ہونی چاہئے، بھارت میں یہ کام بہت تیزی سے پھیل رہا ہے، وہاں فری لانسرز کے کام کا انداز بھی بڑا دلچسپ ہے، وہ لوگ دو دو چار چار کے گروپ بناتے ہیں کچھ کپڑے اور لیپ ٹاپ لے کر کسی پہاڑی تفریحی مقام پر نکل جاتے ہیں وہاں دو ہفتے کے لئے کمرہ کرائے پر لیتے ہیں کام سے بھرپور انصاف کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ تفریحی مقامات کی سیر بھی کرتے ہیں، اس طرح اکٹھے رہ کر وہ ایک دوسرے سے اپنا نالج بھی شیئر کرتے ہیں، یہ چوبیس گھنٹے کرنے والا کام ہے۔ Skill آپ کے پاس موجود ہے ایک عدد کمپیوٹر ہے اور گھر بیٹھے آپ جب چاہیں اُٹھ کر اپنا کام کر سکتے ہیں۔ اچانک آنے والی آفت کرونا نے اس کام کی اہمیت کو مزید بڑھا دیا ہے۔ دنیا بھر میں فری لانسنگ کی بڑھتی ہوئی ڈیمانڈ کی ایک وجہ لائف سٹائل کی بدلتی ہوئی تبدیلی بھی ہے۔ امریکہ اور بھارت اس کام میں بہت تیزی سے ترقی کر رہے ہیں وہاں فری لانسرز کیلئے فائیو سٹار ہوٹلز کی لابی جیسا ماحول، تیز ترین انٹرنیٹ اور پرائیویسی میسر ہوتی ہے۔ اگر آپ کے گھر میں جگہ نہیں یا بجلی کی پرابلم آ رہی ہے تو اپنا لیپ ٹاپ اٹھاتے ہیں اور آرام سے ایسی جگہ پر جا کر اپنا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔ فری لانسنگ کی تیزی سے پھیلنے کی وجہ اس کا تقریباً زیرو انویسٹمنٹ ہونا بھی ہے، ایک کمپیوٹر اور ایک اچھا انٹرنیٹ اس کام کو شروع کرنے کیلئے کافی ہے۔ پاکستان میں اس کام کی طرف لوگوں کا تیزی سے رجحان بڑھ رہا ہے، آپ کوئی Skill تو حاصل کیجئے، نیت تو باندھیے، راستے خود بخود آپ کیلئے بنتے چلے جائیں گے۔ فرصت تو برائیوں کی جڑ ہے یہ کام خواتین اور معذور افراد کیلئے بھی پرکشش ہے۔ آپ نے بھی لالٹین کی ننھی سی کائنات اور اس کی زندگی کے بارے میں غور کیا ہے۔ جو محدود خرچ اور محدود جگہ کے باوجود اردگرد کا سارا ماحول روشن کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لالٹین کو بھی شیشے کے اندر موجود ہوا کو گرم کرنا پڑتا ہے۔ یہ فوراً" گرم ہو کر اوپر اٹھتی جاتی ہے اور اپنے ساتھ پیدا ہونے والا مواد بھی اوپر موجود سوراخوں میں سے باہر لے جاتے ہے اس خلا کو پر کرنے کیلئے نیچے موجود سوراخوں میں سے فریش ہوا اندر داخل ہوتی ہے، یوں کرنٹ چل پڑتے ہیں اور لالٹین کو بڑی تیزی سے تازہ آکسیجن کی فراہمی جاری رہتی ہے۔ صدیوں پہلے لوگوں نے اس راز کو جان لیا تھا، ہمارے نوجوان اس کو سمجھنے سے قاصر کیوں ہیں؟

شاعری

بی بی
(اپنی مرحومہ بیوی کی یاد میں)

مجھ کو یاد ہیں اب تک تیری
میٹھی باتیں!
دن کے قصے
شب کی گھاتیں
سکھ سوغاتیں
جھگڑے
بی بی!!
آنکھوں میں وہ نور ہے اب تک
میں نے کیا تھا گھر کو روشن
میرا دل اب
مدھم مدھم
دھڑکے
بی بی!
تیرے ساتھ مسافت کاٹی
جیون گزرا منزل اُجڑی
سُونے ہیں اب
رستے!
بی بی!
پنچھی بن کر اُڑ جاؤں گا
میں ہوں اکیلا آنسو آنسو
روگ ہے جھیلا
میں نے ہیں پر
کھولے
بی بی!
سن لے بی بی!

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

سخنوری میں یہ مشکل گھڑی بھی آنی ہے
کہ ہوبہو تری تصویر بھی بنانی ہے
جو تیرے قرب کی آسودگی میں گزری تھی
وہ زندگی تو بہت دیر یاد آنی ہے
خدا بچائے چمن کو اُسی کے ہاتھوں سے
وہ جس کے ذمے گلستاں کی پاسبانی ہے
بقول ان کے یہ خوش حالیوں کا دور سہی
مگر وہ گھر کہ جہاں آگ ہے نہ پانی ہے
وہ جانتا نہیں کُھل مل کے بیٹھنا شاید
کبھی بدن کبھی اُس نے نظر چرانی ہے
ہمیں خبر ہے کہ گھر سے اُتارنے کے بعد
ہمارے نام کی تختی کہاں سجانی ہے
کوئی بھی عیب نہیں اُس میں نام کو نصرتؔ
وہ یار جس سے مری دوستی پرانی ہے

نصرت صدیقی/فیصل آباد

میرے دل میں جو رنگ و نکہت ہے
اک گل اندام کی بدولت ہے
راحتِ جاں بھی ہے وہی مہ رُو
جس کی اک اک ادا قیامت ہے
تجھ سے کیسے گریز ہو جاناں
تو محبت بھری ضرورت ہے
تم کسی وقت بھی چلے آنا
آج کل اس قدر فراغت ہے
دل میں رہتی ہے اک خلش پیہم
شاعری بھی عجب مصیبت ہے
بن کے راحت کوئی چلا آئے
سوچ کی وادیوں میں وحشت ہے
ہم ہیں بیمارِ آرزوئے وصال
کیا کسی اور کی یہ حالت ہے؟
آپ آ تو رہے ہیں ملنے کو
کیا کوئی اور بھی بشارت ہے؟
آپ کا لطف ہے سبب اس کا
ان کو راشدؔ سے جو عداوت ہے

ممتاز راشد لاہوری/لاہور

وفا کا ثمر بے وفائی ملے گی
کسی کی تمہیں بھی جدائی ملے گی
پلک پر جلیں گے دیے حسرتوں کے
اُداسی سے یوں آشنائی ملے گی
ترا دل بنے گا دُکھوں کا سمندر
تجھے خامشی کی خدائی ملے گی
کبھی تو دُعاؤں کا غنچہ کھلے گا
درِ مصطفیٰؐ تک رسائی ملے گی
حسینؓ ابنِ حیدرؓ کا ادنیٰ گدا ہوں
مری سوچ یوں کربلائی ملے گی
میں ہوں رند واعظ مجھے یہ خبر ہے
کہاں شب تری پارسائی ملے گی
کبھی ہم نے شاہدؔ یہ سوچا نہیں تھا
زمانے کو دل تک رسائی ملے گی

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

قحط

ایک نظم لکھنے کی کوشش میں تھی
وہ نظم جو کبھی لکھی نہ جا سکی
لفظوں کی تلاش میں
ساری زمین کھنگالی
اُفق تا اُفق دوڑ لگائی
مگر سورج نے اپنی گرمی نہیں دی
چاند اماوس کی چادر میں چھپا دیا
گھٹن نے گھیرا تنگ کیا
مگر سرسراتی ہوا مدد کو نہیں آئی
پتے اپنے ساز بجاتے رہے
پانیوں کے اُچھال نے مجھے نہیں دیکھا
زمین بھاگتے بھاگتے ہانپ گئی
فضائیں اپنی حدود سے باہر نہیں نکل پائیں
اور میں جہانوں کا بوجھ کاندھوں پر اُٹھائے
درد کو تراشتی رہی
زمانے اپنی رفتار بڑھاتے رہے
اور میں ہجر کے تاریک گڑھوں میں
روشنی تلاش کرتے کرتے
لفظوں کے قحط کا شکار ہوتی
اک گہرے درد کے تارِ عنکبوت نے
دنیا کو اس چشمِ حیراں سے دور کیا
جانتی تھی زمانہ اور میں اجنبی ہیں
وہ جس نے مایوسی کو میرا مقدر کیا
وہ بھی تو سوچے
سب کچھ رکھتے ہوئے بھی وہ کس قحط کا شکار ہے

آسناتھ کنول/لاہور

ویسے بے نام سی اُداسی ہے
پھر بھی لیکن بڑی اُداسی ہے
میں جہاں بھی گئی جہاں ٹھہری
ساتھ میرے رہی اُداسی ہے
جو اُداسی کی لو بڑھاتی ہے
میرے اندر وہی اُداسی ہے
رفتہ رفتہ ہی جائے گی آخر
جو بہت دیر کی اُداسی ہے
اب کرونا کے بعد لگتا ہے
جیسے یہ زندگی اُداسی ہے
کیسے مانوس اس سے ہو جاؤں
یہ تو بالکل نئی اُداسی ہے
ایسے لگتا ہے سعدیہ جیسے
میری خاطر بنی اُداسی ہے

سعدیہ سیٹھی/برطانیہ

خاص ہوتا ہے مرے دوست ہر اک کام کا وقت
کتنا اچھا ہے اُداسی کے لیے شام کا وقت
ہم جو رہتے ہیں شب و روز مشقت میں مگن
ایک ہی بار ملے گا ہمیں آرام کا وقت
عمر اس شہر میں اس طرح کٹی ہے جیسے
متقی لوگوں میں گزرے کسی بدنام کا وقت
اپنے اندر سے نکلنے کی ضرورت ہے میاں
کشف کا وقت ہے یہ اور نہ الہام کا وقت
کتنا دلدوز تھا اس شخص کے رُخصت کا سمے
ہم نے ہنس ہنس کے گزارا تھا وہ کہرام کا وقت

عبیداللہ نزاکت/حاصل پور

یہ دِل خدشات سے نکلا نہیں ہے
ابھی دن رات سے نکلا نہیں ہے
ابھی لہریں بھنور کی قید میں ہیں
کنارا گھات سے نکلا نہیں ہے
ابھی پیروں میں منزل کب بچھی ہے
سفر خطرات سے نکلا نہیں ہے
ابھی دریا کا کوزے میں ہے رکھنا
سحر اثرات سے نکلا نہیں ہے
ابھی در نکلا ہے دیوار سے ہی
ابھی درجات سے نکلا نہیں ہے
ابھی تقدیر ہاتھوں میں ہے انصرؔ
مقدر ہاتھ سے نکلا نہیں ہے

انصر علی انصر/فیصل آباد

گر دیکھا کبھی تو نے مجھے خوش نظری سے
دل اپنا ترے ہاتھ پہ رکھ دوں گا خوشی سے
مانگوں گا تیرا پیار میری جان تجھی سے
وعدہ نہ کروں گا میں کبھی اور کسی سے
اقرار کروں گا تو فقط تجھ سے کروں گا
پہلی ہی ملاقات میں یہ سوچ لیا ہے
گر پیار کروں گا تو فقط تجھ سے کروں گا
یہ پہلی ملاقات جنوں خیز ہے کتنی
آنکھوں سے چھلکتی ہوئی مئے تیز ہے کتنی
پھولوں سی جبیں ہائے عرق ریز ہے کتنی
اے حُسن کی دیوی تو کم آمیز ہے کتنی
کیا حُسن کی خیرات عطا کر دو گی مجھ کو
جذبات کی سوغات عطا کر دو گی مجھ کو
رنگینی حالات عطا کر دو گی مجھ کو
پہلی ہی ملاقات میں یہ سوچ لیا ہے
گر پیار کروں گا تو فقط تجھ سے کروں گا
جلوہ ہے تیرے حسن میں خورشید جہاں کا
کس دل پہ لگا آن کے تھا تیر کہاں کا
بسمل ہوں مگر عادی نہیں آہ و فغاں کا
کیا حال کہوں اوروں سے میں زخم نہاں کا

اظہار کروں گا تو فقط تجھ سے کروں گا
گر پیار کروں گا تو فقط تجھ سے کروں گا

سعید پسروری/لاہور

مری کی مال روڈ

مری کی مال روڈ پر
ریڈاونین کے سامنے پختہ تھڑی پر
میں اکثر آپ کو بیٹھا مل سکتا ہوں
میری شکستہ عمر کا ڈھیر وہیں ہوتا ہے
میرے خیال رنگین پیراہن اوڑھے
زندگی سے لدے پھندے چہروں کے ساتھ اُڑ جاتے ہیں
تتلیوں کی مانند گھر نہ آنے کے لیے
ایک دوجے کے سنگ ہاتھ تھامے ہوؤں کے ساتھ
ایک دوجے کا سہارا لیے تھکے ہوئے شانوں کے ساتھ
میں تتلی کا روپ لیے
بادِ صبا کا بہروپ لیے
ہمیشہ انہی کے سنگ اُڑتا رہنا چاہتا ہوں
تتلیوں کی مانند گھر نہ آنے کے لیے
لیکن اکثر یہ شوق مجھے حیران کرتا ہے
جب کوئی تعلق بوجھ ہوتا ہے
اور میرے دل کو ویران کرتا ہے
چہروں کی شادابی، دلوں کی ویرانی
مجھے میرے جسم کی کشش ثقل سے پرے جانے نہیں دیتی
میں شکستہ عمر کے ڈھیر میں واپس آ جاتا ہوں
مری کی مال روڈ پر
ریڈاونین کے سامنے پختہ تھڑی پر
بیٹھے بیٹھے نہ چاہتے میری نظر مل جاتی ہے
ایک پاؤں سے ایڑھ لگاتے ننھے نوجوانوں سے
جو اپنی ریڑھیوں پر ہنستے ہیں
جو وقت سے پہلے بڑے ہوتے ہیں
جو رنگین پیراہن پہنے کبھی کہیں نہیں جاتے
جو کسی تتلی کی مانند گھر نہیں چھوڑتے
یہ گھروں کی روحیں ہیں
کسی کا دل نہیں توڑتے
شانے نہیں ڈھونڈتے
منہ نہیں موڑتے
میری عمر کا شکستہ ڈھیر میرے جسم کی صورت میں
کبھی اس تھڑی سے اُٹھنا نہیں چاہتا
میں اب ان محنت کشوں کی طرح
کہیں جانا نہیں چاہتا
میں روح بن کر تتلی کی مانند
ان کے سنگ چلنا نہیں چاہتا
کیونکہ مجھے ڈر ہے
یہ سچی ہنسی مجھے راس آئے گی
ان کے سچے جذبے مجھے جکڑ لیں گے
میری روح کی تتلی کو میرے شکستہ جسم
میں نہیں آنے دیں گے
میرے پاؤں پکڑ لیں گے

احمد عدنان طارق/فیصل آباد

اس درجہ ہوئی دل میں ہے آباد اُداسی
لگتی ہے مجھے اب میری ہمزاد اُداسی
جیسے مجھے تو نے کیا ناشاد اُداسی
اللہ کرے تو بھی ہو برباد اُداسی
ہوتا ہوں اگر خوش کبھی دو پل کے لیے بھی
دے جاتی ہے پھر آ کے تری یاد اُداسی
دُنیا میں اُتاری گئی جس روز محبت
لگتا ہے اُسی دن ہوئی ایجاد اُداسی
روداد غموں کی وہ بھلا کس کو سنائے
دیتی ہے جسے اپنی ہی اولاد اُداسی
خوشیوں کی ہمیں ہوتی ہے جن سے بڑی اُمید
دے جاتے ہیں اک دن وہی افراد اُداسی
کیسے میں رہوں خوش بھلا اس آب و ہوا میں
دل میرا پرندہ جہاں صیاد اُداسی
تحفے دیئے ہیں عشق نے اکمل کو یہ سارے
غم، ہچکی، آنسو، دلِ اُفتاد اُداس

اکمل حنیف/لاہور

خود اعتمادی

یہ بات سچ ہے
کہ تم نے میرے تمام جذبوں کا پاس رکھا
مجھے بنایا
مجھے سنوارا
مجھے ہی چاہت کا گُر سکھایا
مگر ذرا سا بغور سوچو
جو میں نہ ہوتا
تمہارا جو بن بکھر سا جاتا
تمہارے حصے میں چاہتوں کے حسین موسم
کبھی نہ آتے
جو میں نہ ہوتا

آصف انصاری/لاہور

محبتوں کے سفر میں ہم اکیلے نہ تھے
لیکن میں بہت دور جا چکی تھی
آؤ اور میرا ہاتھ تھامو
کیونکہ میں آگے جا کر
اکیلی رہ گئی ہوں
جو لوگ آگے
اکیلے ہی نکل جاتے ہیں
وہ تنہا رہ جاتے ہیں

نویدہ کوثر/راولپنڈی

بقیہ انٹرویو احمد ندیم قاسمی

س آپ برصغیر کے صفِ اوّل کے شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار ہیں۔ آپ نے ادبی زندگی کا آغاز کس صنف سے کیا؟

ج شاعری سے۔

س ابتداء میں کس سے متاثر تھے؟

ج شاعری میں اقبال، ظفر علی خان اور اختر شیرانی سے اور افسانے میں منشی پریم چند سے۔

س ہم عصر شعراء اور افسانہ نگاروں میں کن سے متاثر ہیں؟ چند ایک نام ضرور لیں۔

ج ہم عصر شعراء اور افسانہ نگاروں میں سے کسی سے متاثر نہیں ہوں۔ البتہ متعدد کو پسند کرتا ہوں مثلاً ن۔م راشد، فیض احمد فیض، احمد فراز، اختر حسین جعفری، شکیب جلالی، رضی اختر شوق اور ساقی فاروقی وغیرہ کی شاعری پسند ہے۔ افسانہ نگاروں میں کرشن، منٹو، بیدی، عصمت، خدیجہ، ہاجرہ، اشفاق احمد، منشاء یاد، رفعت مرتضٰی اور نیلوفر اقبال وغیرہ اچھے لگتے ہیں۔

س آپ کی مادری زبان پنجابی ہے۔ پنجابی میں آپ نے کچھ لکھا۔ اگر نہیں تو کیوں؟

ج میں نے پنجابی میں شاعری کی ہے اور ساتھ ہی پنجابی شعر ونثر کی متعدد کتابوں کے پنجابی ہی میں دیباچے لکھے ہیں۔ مثلاً احمد راہی کے ''ترنجن'' اور سلیم کاشر کے متعدد مجموعے۔

س علاقائی زبانوں خاص طور پر پنجابی کا مستقبل کیا ہے؟

ج نہایت روشن مستقبل ہے۔ جس زبان کو وارث شاہ، بلھے شاہ، سلطان باہو، خواجہ فرید اور میاں محمد بخش کے سے اساتذہ فن میسر ہوں اسے کیسے زوال آ سکتا ہے اور پھر دورِ جدید میں نہایت معیاری پنجابی شاعری بھی ہو رہی ہے۔ پنجابی افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں اور پنجابی ادب کی تنقید بھی چھپ رہی ہے۔

س بقول منیر نیازی ''ترقی پسندوں کی ساری شاعری موضوعاتی ہے'' اور موضوعاتی شاعری گہری شاعری کی ذیل میں نہیں آتی۔ آپ ان کی بات سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟

ج صدفی صد اختلاف کرتا ہوں۔ منیر نیازی اس طرح کے ٹوٹکے چھوڑنے کے عادی ہیں۔ اگر چہ تمام تر ترقی پسند شاعری محض موضوعاتی نہیں ہے لیکن اگر تمام موضوعاتی شاعری اس قدر مذمت کی مستحق ہے تو علامہ اقبال کی موضوعاتی شاعری کو کہاں لے جایئے گا۔ خود منیر نیازی بھی صرف سطح کی شاعری کرتے ہیں۔ انہیں تو گہرائی میں جانے سے باقاعدہ خوف آتا ہے۔

س ترقی پسند یا فحاشی! منٹو کے افسانے کس ذیل میں آتے ہیں؟

ج بیشتر ترقی پسندی کی ذیل میں آتے ہیں۔ اکا دُکا افسانوں پر فحاشی کا شبہ ہوتا ہے ورنہ وہ رد شدہ انسانوں کے حالات کی عبرتناکی واضح کر کے دراصل بہتر معاشرے کی آرزو کرتے ہیں۔

س ''معاصر'' میں فیض کے حوالے سے اپنے مضمون میں آپ نے لکھا ہے کہ فیض بورژوا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور انہی میں خوش رہتے تھے۔ تو آپ کی اس بات کے حوالے سے کیا کہا جا سکتا ہے کہ فیض کی ساری شاعری ترقی پسند منشور کے حوالے سے ان کا اصل چہرہ نہیں ہے؟

ج حسن اور عشق کے موضوعات ابدی موضوعات ہیں اور اگر فیض نے حسن وعشق کی شاعری کی ہے تو یہ بھی ترقی پسندی ہے۔ کیونکہ حسن کی بقاء اور باہمی عشق کی فضا پیدا کرنے سے بڑی ترقی پسندی اور کیا ہوگی؟ دراصل عام ذہن میں ترقی پسندی کو نہایت محدود سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ غالب بھی اپنے دور کا ترقی پسند تھا اور اقبال بھی ترقی پسند تھا۔ چنانچہ فیض کی شاعری بھی ترقی پسندی ہی کی عکاس ہے۔ ترقی پسندی کے منشور میں انسانی وقار کی بحالی اور عوام الناس کے احتجاج کو ختم کرنے کا ذکر ہے اور یہ وہ مقاصد ہیں جو ہر ایماندار اور باضمیر شاعر اور تخلیق کار کے پیش نظر ہونے چاہئیں۔ اگر فیض بورژوا لوگوں میں خوش رہتے تھے یہ ان کی مجلسی مجبوری تھی۔ ورنہ انہوں نے بورژوایت کے حق میں ایک مصرع تک نہیں لکھا۔

س ایک جگہ آپ نے لکھا ہے کہ ''دستِ صبا'' جیل سے مرتب ہو کر ناشر تک پہنچا اور فیض صاحب نے آپ کو لکھا کہ آپ اس مسودے پر ایک نظر ڈال لیں جس کے جواب میں آپ نے ''دستِ صبا'' کے بعض مقامات کے سلسلے میں شبے کا اظہار کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ فیض کے کلام میں کچھ خامیاں تھیں۔ آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ خامیاں کس نوعیت کی تھیں؟

ج ایک عمر اور ایک مرتبے کے شعراء اپنے کلام کے سلسلے میں باہمی گفتگو کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے کی خامیاں تلاش کی جا رہی ہیں۔ میں نے بعض اشعار میں بعض الفاظ کے متبادل الفاظ تجویز کیے۔ جس سے میری رائے میں مفہوم زیادہ چمک اُٹھتا۔ فیض صاحب نے میرے بعض دوستانہ مشورے قبول کیے مگر بعض کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ ان کے کلام میں خامیوں کی نشاندہی کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

س آپ کا شمار ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ اس کا تسلسل آج کے ادب میں کیا اہمیت رکھتا ہے؟

ج میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ بانی تو سیّد سجاد ظہیر، احمد علی اور ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ تھے۔ میں تو ترقی پسند ادب کی تحریک میں 1948ء میں شامل ہوا اور تحریک کا آغاز 1936ء میں ہو چکا تھا۔ رہی یہ بات کہ آج کے ادب میں اس تحریک کی کیا اہمیت ہے تو معدودے چند علامت نگاروں اور تجزیہ نگاروں کو چھوڑ کر ان اکا دُکا اہل قلم

سے قطع نظر جو بڑے سے بڑے تخلیق کار کو تسلیم نہیں کرتے، باقی نوے پچانوے فیصد اہل قلم، غیر شعوری طور پر ہی سہی اس تحریک سے متاثر ہیں اور ان کی تحریریں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

س فیض احمد فیض اور دیگر سینئرز کی موجودگی میں انجمن ترقی پسند کے جنرل سیکرٹری کے طور پر آپ نے اپنی تقرری کو کیسے لیا؟

ج مجھے دور دراز کا بھی اندازہ نہ تھا کہ مجھ پر یہ بم گرے گا۔ میں ترقی پسند تو یقیناً تھا اور ہوں مگر ساتھ ہی ایک سیدھا سادا مسلمان بھی ہوں۔ میرے بارے میں مشہور تھا کہ ملک میں اس شخص کا کوئی مخالف نہیں ہے اور یہ بہت حد تک درست بھی تھا۔ میری مخالفت کا آغاز تو اس وقت ہوا جب میں نے اپنا رسالہ ''فنون'' جاری کیا۔ اس کی مقبولیت نے میرے بعض مخالف پیدا کر دیے ورنہ میں خاصا ہر دلعزیز قلمکار تھا۔ شاید اسی وجہ سے ''بڑے'' ترقی پسندوں نے طے کر لیا تھا کہ مجھے جنرل سیکرٹری بنایا جائے تا کہ ترقی پسندوں کے بارے میں اپنا جو کمیونزم کا پرچار کرنے والوں کی عام افواہ تھی اسے ختم کیا جا سکے۔ جب میرا نام اتنے بڑے عہدے کے لیے تجویز کیا گیا تو میں نے احتجاج کیا کہ فیض احمد فیض صاحب کی موجودگی میں مجھے اس عہدے کے لیے نامزد کرنا زیادتی ہے۔ مگر ''یار لوگ'' شاید فیصلہ کر کے آئے تھے۔ اس لیے میری ایک نہ سنی گئی۔ یہ سب سے بڑی ذمہ داری تھی جو میں نے پانچ برس تک حتی الامکان پوری تندہی سے نبھائی۔

س آپ کے مضمون کے ردعمل میں کچھ ادیبوں کا یہ کہنا ہے کہ فیض میں اگر کچھ خامیاں تھیں یا ان سے آپ کے اختلافات تھے تو ان کا اظہار ان کی زندگی میں ہونا چاہیے تھا۔ اس حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

ج معترض حضرات آئندہ ''معاصر'' میں میرا ایک مضمون پڑھ لیں جو میں نے فیض صاحب کی موجودگی میں بلکہ ان کی صدارت میں پڑھا تھا۔ انہیں تسلی بخش جواب مل جائے گا۔

س آپ کے مضمون میں فیض صاحب کے بارے میں جو مجموعی تاثر بنتا ہے وہ ہر وقت نشے میں مدہوش، شرابی، غائب حاضر دماغ اور ایک لاابالی شخص کا ہے۔ جبکہ اپنی شاعری میں فیض ایک مختلف شخص نظر آتے ہیں۔ اس تضاد کی وجہ؟

ج میرے مضمون میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں جہاں میں نے فیض صاحب کو مدہوش، شرابی، غائب حاضر دماغ اور ایک لاابالی شخص ثابت کیا ہے۔ اس کے برعکس میں نے تو واضح کیا کہ انہیں شراب کا نشہ ہوتا ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ وہ شاعری، مصوری اور موسیقی وغیرہ کے موضوعات پر نہایت دل آویز گفتگو کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرا مضمون غور سے نہیں پڑھا۔ صرف بعض اخباروں کی فساد انگیز سرخیاں پڑھی ہیں۔

س اپنے حوالے سے آپ نے فیض احمد فیض کے جس تعصب کا ذکر کیا ہے کیا آپ اس کی کچھ مثالیں بیان کریں گے۔ اب جبکہ اس بات کو ایک طویل عرصہ گزر گیا ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کو اس تعصب نے کس حد تک متاثر کیا؟

ج مجھے اس ضمن میں جو کچھ کہنا تھا میں اپنے مضمون میں کہہ چکا ہوں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔

س دوران قید حکومت نے آپ کو قومی ترانہ لکھنے کی دعوت دی جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حکومت کو آپ کے مرتبے اور اہمیت کا خیال تھا۔ دوسری طرف آپ کے لیے بھی اعزاز کی بات تھی کہ تمام تر اختلافات کے باوجود حکومت کی طرف سے آپ کو ملک کا ترانہ لکھنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ آپ نے اس دعوت کو کیوں ٹھکرایا، کیا بعد میں اس حوالے سے کوئی پچھتاوا ہوا؟

ج میں کیمبل پور ڈسٹرکٹ جیل میں ایک سی کلاس میں نظر بند تھا۔ تب مجھے جیل کے حکام نے چھاگلہ کی اس ٹیون کا ریکارڈ بھیجا جو میرے نام قومی ترانہ لکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر وہاں خنجر گاڑ دیا گیا ہے۔ مجھے اس دعوت نامے کا شدید دکھ ہوا اور میرے اندازے کے مطابق مجھے دکھ پہنچانے کے لیے چھاگلہ کی ٹیون مجھے جیل کے اندر بھیجی گئی تھی۔ اس صورت میں ترانہ کیوں لکھتا اور اگر لکھتا تو اس میں حکمرانوں کے مظالم کے سوا کیا ہوتا؟

س فیض صاحب کی وفات کے حوالے سے بطور خاص آپ نے لکھا ہے کہ ''20 نومبر کو ان کا انتقال ہو گیا۔ 20 نومبر کو جو میری پیدائش کی تاریخ ہے، ان کی تاریخ وفات قرار پائی'' ان جملوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج صرف دکھ مراد ہے۔ فیض صاحب سے بعض شکایات اپنی جگہ مگر وہ میرے لیے محترم تھے۔ 20 نومبر کو ان کی وفات سے مجھے گہرا دکھ ہوا۔ دس پندرہ روز قبل میں نے اپنے احباب کو اپنی سالگرہ کی دعوت میں بلا رکھا تھا مگر 20 نومبر کو یہ سانحہ ہو گیا۔ میں فیض صاحب کے جنازے کے بعد ان کی تدفین تک اور ان کے مزار پر دعا کرنے کے بعد ہی ہوٹل میں اپنے مہمانوں کے پاس پہنچا۔ ان سے معذرت کی اور چائے کی ایک ایک پیالی پیش کر کے انہیں رخصت کر دیا۔

س فیض صاحب کی شاعری کے حوالے سے آپ نے لکھا کہ ''ان کے ہاں فکری گہرائی نہیں ہے'' یہ فکری گہرائی کیا ہے اور فیض کے ہاں اس کی عدم موجودگی کا کیا سبب ہے جبکہ فیض صاحب ایک پڑھے لکھے شخص تھے اور ان کی شاعری اور دانشوری کا بھی ایک عالم معترف ہے۔

ج ''یہ فکری گہرائی کیا ہے؟'' کے الفاظ سن کر میں حیران ہو گیا کہ کیا آپ جو مجھ سے سوال پوچھ رہے ہیں اتنا بھی نہیں جانتے کہ فکری گہرائی کیا ہوتی ہے۔ غالب اور اقبال کا مطالعہ کیجیے، آپ کو فکری گہرائی کا مفہوم مل جائے گا۔ میں نے بھی اپنے مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ فیض بہت پڑھے لکھے تھے اور اگر وہ چاہتے تو فکری شاعری کو اپنی دوسری شاعری کی طرح شیریں اور مترنم بنا سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور مجھے حیرت ہے کیوں نہیں کیا۔

بقیہ انٹرویو صبیح الدین رحمانی

س نعت خوانی کی ابتدا کیسے ہوئی؟

ج خدا ہی جانے ہمیں کیا خبر کہ کب سے ہے
جواُن کے ذکر کا رشتہ ہمارے رب سے ہے

نعت خوانی سے میرا تعلق تیسری جماعت سے بنا تھا جب اساتذہ نے بلا کر کہا کہ کس بچے نے ہمارے سکول کی نمائندگی کرنی ہے تو سب بچے اپنی آوازیں سنائیں۔ نعت میں تو مجھے یاد ہے ہمارے سکول کی ہیڈ مسٹریس جو کہ بہت جاہ و جلال والی خاتون تھیں انہوں نے اپنے آفس میں سب کو سنا اور مجھے منتخب کیا الحمدللہ۔ اس کے بعد کچھ جماعتیں آگے جا کر مجھے احساس ہوا کہ جیسے مجھے اسی عظیم مقصد کے لیے چنا گیا ہے۔ محسن کاکوروی کا ایک شعر میری نظر سے گزرا:

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعتیں محسن
کلام نعتیہ رکھا مری زباں کے لیے

تو مجھے یوں لگا جیسے یہ شعر محسن کاکورویؒ نے اپنے لیے تو کہا ہی ہے میرے لیے بھی کہا ہے اور مجھے اندازہ نہیں تھا آنے والی زندگی مجھے نعت سے یوں مربوط کر دے گی کہ وہ نعت خوانی ہو نعت گوئی ہو نعت کے حوالے سے اشاعت کا کام ہو یا اس کے حوالے سے مختلف زاویوں سے چیزوں کو فروغ دینے کا کام ہو اللہ مجھے توفیق دے گا تو سوائے میں اسے اللہ کی توفیق کے کچھ اور نہیں سمجھتا۔

س بطور نعت گو اور نعت خواہ کس حیثیت سے آپ خود کو زیادہ مناسب محسوس کرتے ہیں؟

ج میں نعت گوئی اور نعت خوانی دونوں کو اپنے لیے اللہ رب العزت کی نعمت سمجھتا ہوں اور یہ دونوں حوالے مجھے دنیا بھر میں عزت دلاتے ہیں۔ دنیا کے ۲۸ ممالک میں سفر کر کے میں نے اللہ رب العزت اور ان کے محبوب کا ذکر کیا اور کہیں احساس نہیں ہوا کہ لوگ مجھے بحیثیت نعت گو شاعر زیادہ اہمیت دے رہے ہیں یا بحیثیت نعت خواں اہمیت دے رہے ہیں۔ دونوں جگہ یکساں محبوبیت کا سامان ہوا اور میں دونوں نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔

س نعت خوانی میں آپ کن محترم نعت خوانوں سے متاثر ہوئے اور کیا آپ نے کسی نعت خواں کو بطورِ خاص پیش نظر رکھا؟

ج نعت خوانوں میں میں انہی اساتذہ سے متاثر رہا جو مؤدب انداز میں ثنا خوانی کرتے تھے۔ ان کے پڑھنے میں نعت کا حسن موجود تھا ادب موجود تھا۔ لفظ کو اس کی پوری صحت کے ساتھ ادا کرنے کی شرائط پر بھی پورا اُترتے تھے۔ اب ہمارے ہاں نعت خوانی کا جو مروجہ لب ولہجہ ہے بہت تیزی سے بھاگ رہے ہیں لوگ جبکہ ہم جن بزرگوں کو سنتے رہے ہیں یا جو ہم پڑھ رہے ہیں ہمارے ہاں سُروں کے ساتھ ٹھہرنے کو لفظ کو اس کی اہمیت کے ساتھ اُجاگر کرنے پر توجہ دی جاتی ہے اس لیے ایسی نعت خوانی دلوں پر اثر انداز ہوتی ہے بجائے ذہنوں پر اثر انداز ہونے کے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں نئی نسل نعت خوانی کے روایتی اسلوب کے قریب تر ہو اس میں ادب بھی ہے اس میں شعور بھی ہے اس طرح نعت خوانی کے ذریعے دینی باتوں کو پھیلانے اور حضور اکرمؐ کی محبت کو فروغ دینے کے زیادہ توانا امکانات سامنے آتے ہیں۔

س کیا نعت گوئی میں عصرِ حاضر کے شعراء کے ہاں ایسی نادر نعتیں میسر آ جاتی ہیں جو کہ کلاسیکی اور جدید نعت گو شعراء کے ہاں ملتی ہیں۔

ج ہر عہد کا اپنا ڈکشن اور لفظیات ہوتی ہیں اور اس کا اپنا بیانیہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جو نعت کہی جا رہی ہے یوں سمجھئے قیامِ پاکستان کے بعد جو اساتذہ آئے اور ۹۰ کی دہائی تک جو چیزیں انہوں نے کہیں ان میں اساتذہ اور نئے لکھنے والوں نے بہت اہم اور بہت مختلف نعتیں کہیں۔ نئے ذائقے نعت کے نظر آتے ہیں مثلاً ہمارے جو ترقی پسند شعراء نعت کہہ رہے ہیں ان میں انسان دوستی بہت نمایاں ہو کر سامنے آئی اور یہ ہماری نعت کا جو مزاج ہے اس سے ہٹ کر ایک چیز تھی۔ انسان دوستی کے حوالے سے جتنی توانائی اور جتنی خوب صورتی سے یہ جذبہ ترقی پسندوں کے ہاں دیکھنے میں آیا ہے اس سے پہلے نہیں ملتا۔ کیونکہ اس سے قبل حضور اکرمؐ سے عقیدت، محبت اور سیرت کے حوالے سے مضامین پیش کیے جاتے تھے۔ انسان دوستی کے موجد اگرچہ حالی تھے۔ انہوں نے بہت ہمت کے ساتھ ان منازل کو طے کیا۔ تنقید بھی سہی داد بھی سمیٹی۔ اُس کے علاوہ وہ نوجوان شعرا جو غزل میں اپنا لب ولہجہ ترتیب دے چکے تھے۔ وہ جب نعت کی طرف آئے تو ان کو بہت اعتبار ملا۔ غزل کے لہجے میں جو تربیت ہوتی ہے شعر کہنے کی وہ نعت میں کام آتی ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ غزل کے بھرپور شاعر جب نعت کی طرف آئے تو ان کا ڈکشن مختلف ہو گیا۔ مگر اب ماشاء اللہ جو جدید غزل گو نوجوان شاعر آئے ہیں۔ انہوں نے بڑی تازہ نعتیں لکھی ہیں۔ میں حیران ہوں اور میرے لیے یہ خوشی کا باعث ہے چونکہ میں تیس برس سے رسالہ نکال رہا ہوں۔ نعت کا ابتدائی نعت بہت توانائی اور تازگی کے ساتھ سامنے آ رہی ہے۔

س فروغ نعت خوانی کے لیے آپ کی کیا تجاویز ہیں؟

ج الحمدللہ نعت خوانی کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ ہم

''ورفعنا لک ذکرک'' کے سائے میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن ابھی بہت کام باقی ہے۔سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جارہا ہے، انفرادی اور علاقائی سطح پر ہو رہا ہے۔ایسے کاموں کو مربوط کر کے سامنے لانے کی ضرورت ہے جس کے لیے ایک مرکزی پلیٹ فارم کا ہونا ضروری ہے۔ہم پاکستان میں نعت خوانی کے حوالے سے اب تک کئی چیزوں میں غفلت کا شکار ہیں۔نعت خوانی کی پاکستان میں ایک تاریخ مرتب کی جانی چاہیے اور وہ بھی فوراً کہ اس شعبے کے سینئر لوگ ایک ایک کر کے ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔قیامِ پاکستان کے فوراً بعد نعت خوانی کا ماحول، سامعین، افراد، ادارے اور نعت خوانوں کا اصول مرتب کرنا عصر حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔پھر نعت خوانی کے بدلتے رجحانات، اہم تنظیموں کی کارکردگی موضوع گفتگو ہونا چاہیے تاکہ آئندہ آنے والی تنظیمیں ان کارہائے نمایاں کے تناظر میں اپنے سفر کو آگے جاری رکھ سکیں۔جانے والے جا چکے مگر ابھی ہمارے درمیان منظور الکونین، شہر یار قدوسی، بشیر حسین ناظم جیسے بزرگ لوگ موجود ہیں جو یہ تاریخ مرتب کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔''مرکز نعت'' اگر اس کام کی ذمہ داری لے تو ممکن ہے کہ کام جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچے پھر اکابر نعت خوانوں کی آوازوں کو محفوظ کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ہمیں ''آواز خزانہ'' کو محفوظ کرنا چاہیے۔آج بھی کتنے سینئر ثنا خوانوں کی پڑھی ہوئی نعتیں میسر نہیں ہیں۔اگر کسی کے پاس اس طرح کی کیسٹیں یا آوازیں محفوظ ہوں تو وہ بتائیں تاکہ ان کی حفاظت کا بھی کوئی بندوبست کیا جا سکے اور ایسے بے شمار کام ہیں جو ابھی ہم پر فرض ہیں لیکن مجھے خوشی ہے کہ کم از کم اب لوگوں نے اس طرح سوچنا تو شروع کر دیا ہے۔

س اچھا یہ بتائیے کہ کسی نعت خوان کو کلام منتخب کرتے ہوئے کن امور کا خیال رکھنا چاہیے؟

ج کسی بھی نعت خوان کو پہلے اندر یہ احساس ذمہ داری پیدا کرنا چاہیے کہ اللہ رب العزت نے اسے اُمت نبی کریم ﷺ میں ایک ممتاز حیثیت عطا کی ہے کہ وہ ہزاروں کے مجمع سے مخاطب ہو رہا ہے اور اس مخاطب کی اپنی تقدیس اور تقاضے ہیں کہ وہ ایک تبلیغی فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔جب یہ جذبہ اس میں بیدار ہو جائے گا تو وہ جو عمل بھی کرے گا، اسے انتہائی ذمہ داری اور سنجیدگی سے کرے گا اور اسے یہ جان لینا چاہیے کہ عوام الناس اپنے پسندیدہ نعت خوان سے جو کچھ بھی سنتے ہیں، اسے ہی دین سمجھتے ہیں۔لہٰذا ہمیں نعتیہ کلام انتخاب میں حد درجہ محتاط ہونا چاہیے۔مشتبہ اور دینی مزاج اور دینی احکامات سے آگاہی رکھنے والے شعراء کا کلام منتخب کرنا چاہیے تاکہ احکامات شریعہ کی نفی نہ ہو اور ادب کے قرینوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی عقیدتوں کا اظہار کیا جائے۔

س کاروانِ نعت کا ایک سال مکمل ہونے کو ہے، آپ اسے کس طرح دیکھتے ہیں؟

ج نعت رنگ کی بے مثال کامیابی کے باوجود میرے دل میں ایک ملال تھا کہ میں شعبہ نعت خوانی کے لیے نعت رنگ میں کچھ نہیں کر پایا اور وہ ایک خالص علمی و ادبی نوعیت کا پرچہ ہے جسے نعت خوانی کے حلقے کم ہی جانتے ہیں۔اس صورت حال میں ضروری تھا کہ میں یا کوئی اور دوست یہ فریضہ انجام دے۔میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے دوست جو لاہور میں مقیم ہیں، جناب شوکت علی سے کیا اور انہوں نے بخوشی اس کام کی ذمہ داری لی اور اپنے ساتھ دوستوں کی ایک ٹیم بنائی جس میں جناب محمد ابرار حنیف مغل بھی نمایاں حیثیت میں شامل تھے۔کاروانِ نعت کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس کا اصلاحی کردار بھی سامنے آیا اور لوگ متوجہ ہوئے مگر شوکت علی صاحب اپنی کاروباری مصروفیات کے باعث جلد اس کاروان قیادت سے دستبردار ہو گئے اور اس کارواں کی قیادت جناب محمد ابرار حنیف مغل صاحب نے بخوشی قبول کی۔مجھے خوشی ہے کہ محمد ابرار حنیف مغل نے اپنے کاروانِ نعت کے اصلاحی پہلو کو بھی روشن رکھا اور دیگر امور پر خاصی محنت کی جس کی وجہ سے آج یہ رسالہ نعت خوانی کے حلقے میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔وہ ایک کامیاب مدیر ہیں۔ایک ایسے شعبے میں محمد ابرار حنیف مغل اور کاروانِ نعت کی ان کامیابیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور ان کی کامرانیوں کے لیے دعا گو بھی ہوں۔

کسی مقصد سے بھجوایا گیا تھا

کسی مقصد سے بھجوایا گیا تھا
میں بہکا تھا نہ بہکایا گیا تھا
مری مرضی کہاں پوچھی گئی تھی
مجھے بس حکم فرمایا گیا تھا
مری حیرانیاں تھیں دیکھنے کی
مجھے جب خود سے ملوایا گیا تھا
ترے نقشِ قدم پر سر جھکانے
مری دیوار کا سایا گیا تھا
دلوں میں روشنی بھر دی گئی تھی
قلم سے علم سکھلایا گیا تھا
مری ہی عقل پر پتھر پڑے تھے
مجھے ہر گام سمجھایا گیا تھا
اگر وہ خود ہی سب کچھ تھا تو آکاش
مجھے کیوں سامنے لایا گیا تھا

احمد سبحانی آکاش/لاہور

مختصر ادبی خبریں

✦ غزل اور متعدد نعتیہ مجموعوں کے تخلیق کار صدارتی ایوارڈ یافتہ شاعر نعت نگار جناب خورشید بیگ میلسوی انتقال کر گئے۔ مرحوم نے زندگی بھر علم وادب کی آبیاری کی۔ بہت سے نوجوانوں نے آپ سے فنِ عروض سیکھا۔ خورشید صاحب نے میلسی میں رہ کر ملکی سطح پر ادب میں اپنا نام بنایا۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے اور ان کے درجات بلند کرے۔ آمین

✦ معروف قومی سیرت ایوارڈ یافتہ نعت گو شاعر اور معروف صحافی عمران نقوی رضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ وہ کافی عرصہ سے علیل تھے اور مقامی ہسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

✦ پرائیڈ آف پرفارمنس معروف گلوکار شوکت علی کو سی ایم ایچ لاہور میں منتقل کر دیا گیا۔ بلڈ پریشر لو ہونے کی وجہ سے حالت تشویش ناک ہو گئی تھی۔ آرمی چیف کی ہدایت پر انہیں CMH لاہور منتقل کیا گیا۔ عظیم فنکار کی صحت یابی کے لیے دعاؤں کی اپیل ہے۔

✦ اکادمی ادبیات پاکستان کے لاہور مرکز کے تحت ''اہلِ قلم سے مکالمہ'' کے عنوان سے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر یوسف خشک چیئرمین اکادمی ادبیات آف پاکستان نے کی۔ اس مکالمے میں امجد اسلام امجد، ڈاکٹر خواجہ ذکریا، اصغر ندیم سیّد، ڈاکٹر فخر الحق نوری، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر ناصر بشیر، ڈاکٹر غافر شہزاد، یاسمین حمید، نیلم احمد بشیر، سلمیٰ اعوان، ڈاکٹر عطیہ سیّد، ڈاکٹر نجیب جمال، کرامت بخاری، ڈاکٹر خالد سنجرانی، رابعہ رحمٰن، شہناز نقوی، شبہ طراز، ڈاکٹر ایوب ندیم اور حسین مجروح شامل تھے۔

✦ حلقہ اربابِ ذوق لاہور کا تنقیدی اجلاس پاک ٹی ہاؤس میں منعقد ہوا جس کی صدارت ایوب ندیم نے کی۔ جبکہ مہمانِ خصوصی حسن عباسی تھے۔ ہمایوں پرویز رشید نے اپنی دو غزلیں تنقید کے لیے پیش کیں جن کے حوالے سے بھرپور گفتگو ہوئی۔ اجلاس کے آخر میں مہمانِ خصوصی حسن عباسی اور صاحبِ صدر ایوب ندیم نے اپنا منتخب کلام پیش کیا۔

✦ پاک برٹش آرٹس کا 22 واں آن لائن مشاعرہ 22 اکتوبر بروز جمعرات منعقد ہوا۔ جس کی صدارت جلیل عالی نے کی۔ جبکہ مہمانانِ خصوصی محبوب ظفر اور نیلم احمد بشیر تھے۔ نقابت کے فرائض زعیم رشید نے ادا کیے۔

✦ سائبان فورم کے زیرِ اہتمام گوجرانوالہ میں نوید بہار مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی میزبانی سائبان فورم کے روحِ رواں عتیق انور راجہ نے کی۔ اس مشاعرے میں پنجاب بھر سے معروف شعراء نے شرکت کی۔

✦ بزمِ ترنم کے روحِ رواں اور چیئرمین محمد اقبال پیام کے دو شعری مجموعوں ''اس کا ملنا تو خواب جیسا تھا'' اور ''پھر وہی شام'' کی تقریب پذیرائی ادارہ خیال وفن اور اکیڈمی ادبیات آف پاکستان کے زیرِ اہتمام اکیڈمی ادبیات کے دفتر میں منعقد ہوئی۔ صدارت معروف شاعر اقبال راہی نے کی۔ مہمانِ خصوصی شاعر اور سفرنامہ نگار حسن عباسی اور مہمانِ اعزاز رفعت علی علوی تھے۔ نظامت کے فرائض ممتاز راشد لاہوری نے بخوبی ادا کیے۔ تقریب میں لاہور کے معروف شعراء نے شرکت کی۔ اس موقع پر اقبال پیام کو پھولوں کے تحائف اور منظوم نذرانہ عقیدت بھی پیش کیا گیا۔

✦ حلقہ اربابِ ذوق لاہور کا ہفتہ وار تنقیدی اجلاس 25 اکتوبر 2020ء بروز اتوار شام 5 بجے آن لائن منعقد ہوا۔ صدارت ڈاکٹر محمد نعیم نے کی۔ احمد محی الدین نے نظم اور محمد عامر نے غزل تنقید کے لیے پیش کی۔ الیاس بابر اعوان نے ''ایڈورڈ سعید کے فکری مغالطے، ایک ردِ تشکیلی مطالعہ'' مضمون پیش کیا۔

(سیکرٹری حماد نیازی)

✦ ''بزمِ اخگر'' کا ماہانہ مشاعرہ چار اکتوبر 2020ء کو راؤ محمد کلیم ہال نزد جنرل ہسپتال لاہور میں ہوا۔ صدارت: سکندر سہراب، مہمانانِ خصوصی، ممتاز راشد لاہوری، ندیم شیخ، ضیا فاروقی، افضل ساجد، پروین وفا ہاشمی، نظامت: یوسف یار

✦ اکادمی ادبیات (اپر مال لاہور) میں نامور مصور اسلم کمال کے اعزاز میں تقریب 27 اگست 2020ء کو ہوئی۔ صدارت مدیر ''الحمرا'' شاہد علی خان نے اور نظامت ممتاز راشد لاہوری نے کی۔ مقررین میں اقبال راہی، ڈاکٹر فوزیہ تبسم، ظفر سپل، ثمر عاصم بٹ شامل تھے۔

✦ بزم انجم رومانی اور ادارۂ خیال وفن کی مشترکہ تقریب بہ اعزاز آفتاب خاں 15 ستمبر 2020ء کو اکادمی ادبیات اپر مال لاہور میں ہوئی۔ صدارت: حسین مجروح، مہمانانِ خصوصی: اقبال راہی، ڈاکٹر ایوب ندیم، نظامت: ممتاز راشد لاہوری۔ کئی مقررین نے خطاب کیا۔ بھرپور مشاعرہ بھی ہوا۔ سالگرہ کا کیک بھی کٹا۔

✦ ڈیرہ غازی خاں کے سیّد طاہر کے شعری مجموعہ ''تصرف'' کی تقریب رونمائی ادارۂ خیال وفن اور اکادمی ادبیات اپر مال لاہور کے اشتراک سے 18 ستمبر 2020ء کو ہوئی۔ صدارت: نذیر قیصر، مہمانانِ خصوصی: جان کاشمیری، فوزیہ سحر، شاہ دل شمس اور ملک عرفان خانی، نظامت ممتاز راشد لاہوری نے کی۔ پھر بین الاضلاعی بھرپور مشاعرہ بھی ہوا۔ پروفیسر شفیق احمد خان کی ''تصرف'' پر گفتگو مفصل اور جامع تھی۔

✦ پنجابی ادبی سنگت کا ہفتہ وار اجلاس 2 اکتوبر 2020ء کو پلاک میں ہوا۔ صدارت: ڈاکٹر صغرا صدف، مہمانِ خصوصی: پروفیسر ڈاکٹر عباد نبیل، نظامت: حافظ جنید رضا، شعراء میں ممتاز راشد لاہوری، عدل منہاس لاہوری، شہزاد تابش اور دیگر بھی تھے۔

تبصرہ کتاب

نام کتاب : فارسی شاعری میں لاہور / تبصرہ نگار: پروفیسر ڈاکٹر معین نظامی

لاہور کم وبیش ایک ہزار سال سے شاعروں، ادیبوں، فن کاروں، صوفیوں اور دانشوروں کا اہم مرکز چلا آتا ہے۔ ان سب طبقات کے نمائندوں نے اپنے اپنے رنگ میں عہد بہ عہد اس شہر بے مثال سے اپنی وابستگی کا اوالہانہ اظہار بھی کیا ہے نشیب وفراز کے کسی تاریخی دور میں بھی لاہور سے اظہار محبت کی یہ روایت ماند نہیں پڑی بلکہ اب تو روز افزوں ہی لگتی ہے۔

محبت لوگوں سے ہو، جگہوں، چیزوں، موسموں یا کچھ کیفیتوں سے، قابل تعریف ہوی ہے وابستگی کا احساس اور اس کا خوب صورت اظہار انسانی زندگی کا بہت خوش آئند پہلو ہے۔ معاشروں می ں اس احساس کا قائم اور پھولتے پھلتے رہنا نفسیاتی صحت، تخلیقی زرخیزی اور انسانی قدروں کی بقا کی باب میں بہت امید افزا ہے۔

بہت سے ایرانی، تورانی اور افغانی فارس کو شاعر ادھر ادھر آتے جاتے ہوئے چند دن لاہور میں ٹھہرے۔ کئی سخن وروں نے یہیں وفات پائی۔ ان میں سے بعض کے جسد خا کی مقدس مقامات پر منتقل کئے گئے۔ کچھ شعرا مستقلاً یہیں مقیم بھی ہوئے۔ دور جدید میں سیاحت یا علمی خدمات کے لیے آنے والے کئی ایرانی، افغانی اور کم از کم ایک ترکی شاعر نے لاہور کو فارسی شاعری میں بے حد سراہا۔

تاریخ کے ہر دور میں بہت سے لاہوری شعرا بھی فارسی میں شعر کہتے رہے۔ ان کے یہاں بھی مدح لاہور کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ لاہور کی تعریف میں چند ایسے شعرا کا کلام بھی ملتا ہے جو زندگی بھر لاہور نہیں دیکھ پاتے، بن دیکھے ہوی حسرت دیدار کا اظہار کرتے رہے۔

لاہور کی مدح وستائش کرنے والوں میں بڑے بڑے اہم اور معروف شعرا کے نام ملتے ہیں جنہوں نے تقریباً تمام کلاسیکی اصناف میں دادِ سخن دی بلکہ ایک آدھ نے تو آزاد نظم کی شکل میں بھی اظہار احساسات کیا۔ یہ شاعر مختلف مذہبوں، علاقوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایسے اکثر شاعروں نے لاہور، اس کے لوگوں، عالموں، صوفیوں، شاعروں، فن کاروں، آب و ہوا، نہروں، باغوں، درختوں، پھولوں، پھلوں، پرندوں، سبزیوں غذاؤں، مسالوں، دست کاریوں، گلیوں محلوں، بازاروں، لباسوں، عمارتوں، تہواروں، کھیلوں، رسموں اور سماجی سرگرمیوں وغیرہ کو منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ اکا دکا دل جلوں نے اس کی دو چار ہجویں بھی کہہ رکھی ہیں۔

سینکڑوں اشعار پر مشتمل یہ اچھا خاصا قابل قدر ادبی اور ثقافتی ذخیرہ ہے۔ بدقسمتی سے اس کا بیشتر حصہ ابھی تک نامرتب اور غیر مطبوعہ صورت میں قلمی نسخوں میں دیمک سے نبرد آزما اور معدومی کے خطرے سے مسلسل دوچار ہے۔

ایسے تمام کلام کی ممکنہ حد تک جمع آوری اور اس کا اردو اور انگریزی ترجمہ بہت ضروری ہے۔ بلکہ فارسی نثر بھی مدح لاہور میں شاعری سے پیچھے نہیں رہی۔ ایسے تمام نثر پارے بھی موضوع انتخاب و ترجمہ بننے کے لائق ہیں۔ کئی مقامی زبانوں کی شاعری میں بھی لاہور سے دلی وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایسی تخلیقات پر بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ سارے مجوزہ منصوبے بہت محنت طلب ہیں اور لگن سے جم کر کام کیے بغیر مکمل بہتر طور پر مکمل ہونے والے نہیں ہیں۔

اس سلسلے میں لاہور در شعر فارسی کے نام سے ایک بہت اچھی علمی و تحقیقی کاوش 2012ء میں ادارہ تاریخی تحقیق، لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔ شعبہ فارسی، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر انجم طاہرہ کی یہ لائق تحسین کاوش فارسی میں ہے اور غالباً اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہونے کا اعزاز بھی رکھتی ہے۔

فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے ہی اس کا اتنا تعارف بھی نہیں ہو سکا، جتنا اس کا استحقاق تھا۔ اسی سبب سے عام اردو دان طبقہ بھی اس سے شایانِ شان استفادہ نہیں کر سکتا۔ اگر اس کا معیاری اردو ترجمہ ہو سکے تو بہت اچھا ہوگا۔ یہ کام کسی باصلاحیت اور باذوق طالب علم کے تحقیقی مقالے کے طور پر بھی انجام پا سکتا ہے۔

ایک سو ساٹھ صفحات کی اس کتاب میں بہتر شاعروں کا مختصر تعارف اور لاہور سے متعلق ان کا خوب صورت کلام شامل کیا گیا ہے۔ کئی شعر پارے اس میں پہلی بار طبع ہوئے ہیں جنہیں مختلف قلمی نسخوں سے منتخب کیا گیا ہے۔

نعت خوانی حبِ رسول ﷺ کا مترنم اظہار ہے

QTV پر ریسرچ ڈائریکٹر اور ادارے کا ہیڈ بھی رہا

شاہین ائیر لائن کا کنٹری مینیجر رہا، بیرون ملک بہت محبت اور پذیرائی ملتی ہے

ریسرچ سکالر نعت خواں سید صبیح الدین رحمانی

سے حسن عباسی اور لبنیٰ صفدر کی گفتگو

نعت رنگ کے ذریعے تفہیم نعت کی ادبی تحریک کا آغاز کیا جسے توقع سے بڑھ کر پذیرائی حاصل ہوئی

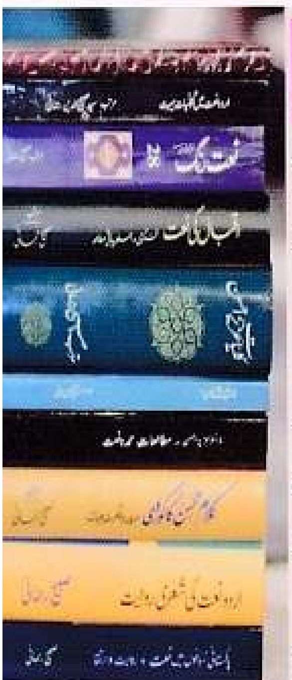

وہ جب نعت پڑھتے ہیں تو لوگوں کو ایک روحانی اور وجدانی سحر میں مبتلا کر دیتے ہیں

سید صبیح الدین رحمانی فروغِ نعت کے حوالے سے ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ نعت گوئی، نعت خوانی، نعت پر ریسرچ، نعتیہ کتب کی اشاعت، نعتیہ رسائل و جرائد کی اشاعت، بین الاقوامی طور پر فروغِ نعت کے لیے تنظیم سازی ان کی پہچان کے واضح اور بڑے حوالے ہیں اور ان حوالوں میں سے ہر حوالہ اپنے اندر جدوجہد اور کارگزاری کی ایک داستان کو سموئے ہوئے ہے۔ آپ نے نہ صرف خود کام کیا بلکہ اپنے قریب آنے والے ہر نعت پسند اور ہم خیال دوست کو خدمتِ نعت کی عملی شاہراہ پر گامزن کیا۔ الحمد اللہ آج نعت رنگ کے علاوہ کاروانِ نعت، سفیرِ نعت اور نعت نیوز جیسے جریدے آپ کی ''حوصلہ افزائی'' کی فضا میں فروغِ نعت کے اہم فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی خدمت نعت سے عصرِ حاضر کے نامور نقاد محقق ''مشفق خواجہ'' کا یہ جملہ کتنا بامعنی نظر آتا ہے۔

''نعت صبیح رحمانی کے حق میں حرفِ دعا بن گئی ہے''۔

اس خاص اشاعت میں شاہ صاحب کے نعت خوانی کے حوالے سے تجربات و مشاہدات سے استفادہ ضروری معلوم ہوتا ہے لہٰذا ہم آج نعت خوانی کی مقبولیت، افادیت، فروغ کے مزید امکانات کے حوالے سے ہی اپنی گفتگو کو محدود رکھیں گے۔

(باقی اندرونی صفحات پر)

کالج آف یوتھ ایکٹوزم اینڈ ڈویلپمنٹ کے زیر اہتمام

یوتھ تخلیقی اظہار فیسٹیول

آن لائن مشاعرہ

فیصل ندیم، نسیم خان، نوشین قمبرانی، وصاف باسط، فرح خان، ظہور منہاس، صنوبر الطاف، سدرہ افضل، عامر بن علی، شمع افروز اور میزبان احمد وقاص اپنا کلام سنا رہے ہیں۔

کرونا وائرس نے دنیا بدل ڈالی ہے۔ مرگ انبوہ مگر Covid-19 کا صرف ایک پہلو ہے۔ اگرچہ انسانی جانوں کے بے پناہ زیاں کے سامنے باقی سب باتیں ہیچ لگتی ہیں پھر بھی اس کرۂ ارض پر بسنے والے لوگوں کے طرز زندگی پر پڑنے والے اثرات اور انمٹ نقوش کا تذکرہ کیے بغیر ہمارے عہد کی تاریخ مکمل نہیں ہوگی۔ اس وباء کے دوران کچھ خوشگوار بدعتیں بھی وجود میں آئی ہیں۔ ان چند خوشگوار تبدیلیوں میں سے ایک آن لائن مشاعروں کا رواج بھی ہے۔ مشاعرے کی خوبصورت روایت صدیوں سے ہمارے ہاں موجود ہے۔ یہ مشاعرہ ہی ہے جو مشرقی شاعری کو پرفارمنگ آرٹ بناتا ہے۔ کالج آف یوتھ ایکٹوازم اینڈ ڈویلپمنٹ نامی ہماری تنظیم ہر سال ایک یوتھ فیسٹیول کا اہتمام کرتی ہے۔ کرونا وائرس کے سبب اس برس یہ تین روزہ تقریبات آن لائن منعقد ہوئیں۔

افتخار عارف سے محو گفتگو ڈاکٹر علی کمیل قزلباش اور رزاق فہیم۔ دوسری جانب عارفہ سید اظہار خیال کر رہی ہیں

اہتمام:

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش

رزاق فہیم

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com